اشاعت کا
49واں سال

Monthly AWAMI JAMHURIAT karachi
اشاعت کا 49واں سال
ماہنامہ
عوامی جمہوریت
اگست 2017

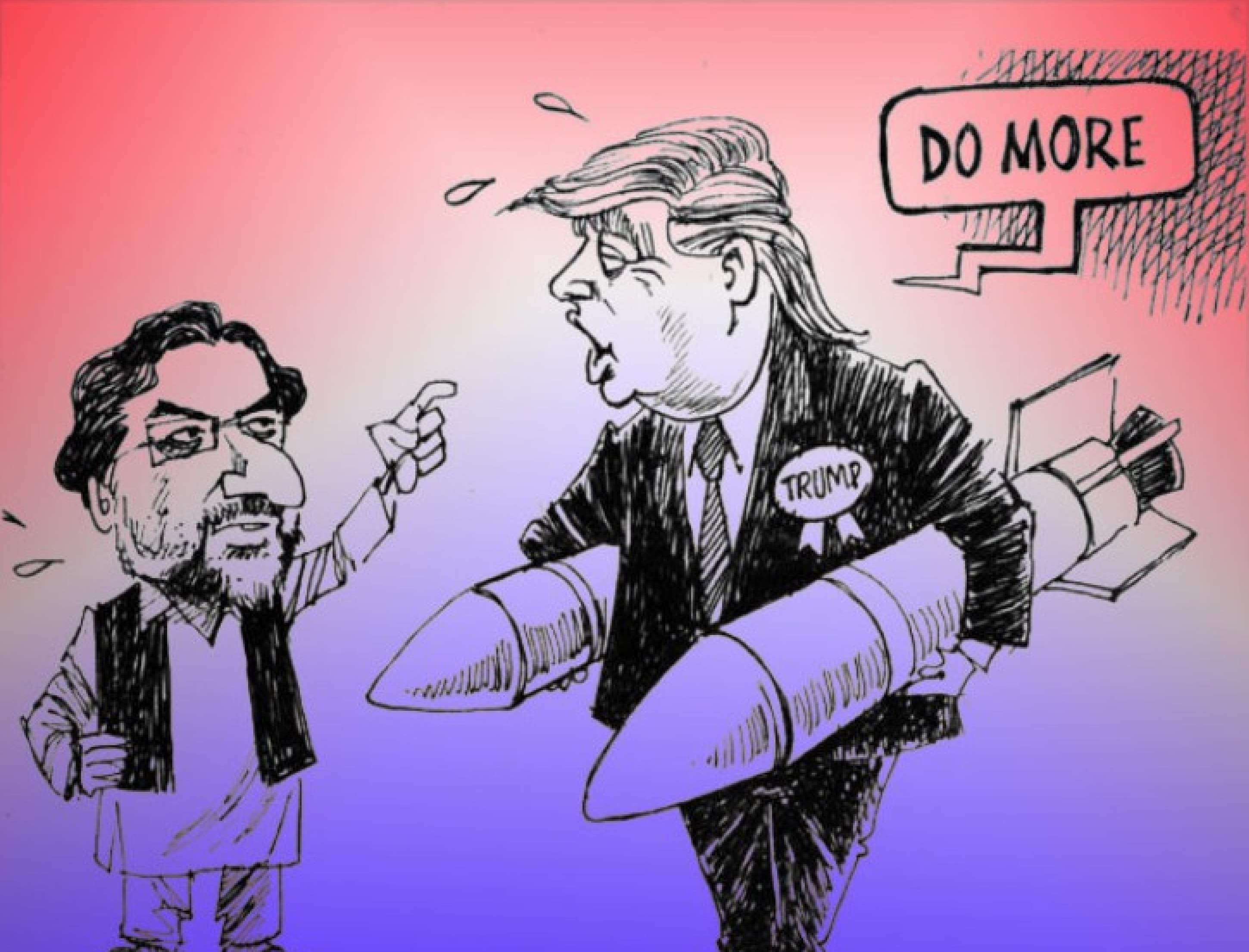

ٹرمپ افغان پالیسی، امریکہ تسلط سے آزادی؟

لیڈی ہیلتھ ورکرز کے مطالبات کی حمایت میں عوامی ورکرز پارٹی نصیرآباد کا مظاہرہ

لیڈی ہیلتھ ورکرز کے مطالبات کی حمایت میں عوامی ورکرز پارٹی حیدرآباد کا مظاہرہ

شمارہ نمبر-06 | جلد نمبر 13

MONTHLY
AWAMI JAMHURIAT
LAHOR

ماھنامہ عوامی جمہوریت لاہور

CPL NO. 279

اگست 2017 | قیمت 30 روپے

ادار یہ

ٹرمپ افغان پالیسی نئی حکمت عملی

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے 19 اگست 2017 کوکیمپ ڈیوڈ میں امریکی دفاہی اور خارجہ پالیسی ترتیب دینے والی قیادت سے طویل مذاکرات کے بعد اعلان کیا کہ امریکی افواج نہ صرف طویل المدت عرصے کے لیئے افغانستان میں رہیں گی بلکہ چار ہزار مزید فوجی روانہ کیے جائیں گے، اس اعلان سے افغانستان میں امریکی کمانڈروں کو فوج کشی کے لامحدود براہ راست اختیار بھی دینے کا اعلان کیا گیا، امریکی صدر نے پاکستان کو براہ راست نشانہ بنایا اور پاکستان کوافغانستان میں گھمبیر صورتحال کا ذمہ دار ٹھہرایا، ٹرمپ نے کہا گوکہ پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں قربانیاں دی ہیں مگر پاکستان اربوں ڈالر لینے کے باوجود اپنے ہاں خوفناک دہشت گردوں کومحفوظ پناہ گاہیں مہیا کرتا ہے، وہ مذہبی انتہا پسندوں کوتحفظ دیتا ہے ٹرمپ نے کہا کہ 20 سے زیادہ بیرونی دہشت گرد تنظیمیں افغانستان، پاکستان اور اس خطے میں موجود ہیں جو امریکی اتحادی افواج سے برسر پیکار ہیں وہ اگر پاکستان ان کے خلاف مؤثر کارروائیاں نہیں کرے گا اور محفوظ پناہ گاہیں ختم نہیں کرے گا تو اس کے نتائج بھگتنا پڑیں گے، اس کے ساتھ ہی امریکی صدر نے بھارت کی تعریف کرتے ہوئے نہ صرف افغانستان کی معاشی ترقی میں اس کے کردار بلکہ جنوبی ایشیاء اور ہند پیسفک میں وسیع تر علاقائی ترقی امن اور سلامتی کے لیے اہم کردار ادا کرنے پر زور دیا۔ اس اعلان سے تقریباً ایک سال قبل ٹرمپ نے کہا تھا کہ ہم افغان جنگ ہار رہے ہیں انہوں نے مایوسی کے عالم میں افغانستان میں امریکی افواج کے کمانڈر جنرل نکلسن کو ہٹانے کی تجویز دیتے ہوئے کہا تھا کہ امریکی فوجی جانیں دے رہے ہیں اور چینی کھربوں ڈالرز افغانستان کی معدنیات سے کمارہے ہیں، اس لیے موجودہ جنگی اعلان میں ٹرمپ نے کہا ہے کہ ہم یہ جنگ مفت میں نہیں لڑ رہے ہم طویل مدت بلکہ لامحدود عرصے کے لیئے موجود رہیں گے اور ہمارے معاشی، معدنی مفادات ہیں، افغانستان اور اس خطے میں مصدقہ سروے رپورٹس کے مطابق باقی معدنیات کے علاوہ دنیا کے سب سے بڑے تانبے کے ذخائر موجود ہیں، جن پر کئی بین الاقوامی طاقتوں کی نظریں لگی ہیں جن میں روس، چین، امریکہ، یورپ سبھی شامل ہیں، اس لیئے افغانستان کی جنگ اور امن میں کئی اسٹیک ہولڈرز ہیں، امریکہ گذشتہ 15 سالوں میں 714 ارب ڈالر افغانستان میں خرچ کر چکا ہے اور اب بھی 60 فیصد سے زیادہ افغانستان پر طالبان کا قبضہ ہے یا افغان حکومت کی عملداری نہیں ہے، عراق اور افغانستان میں امریکی افواج کی موجودگی، ایران اپنی سلامتی کے لیئے بہت بڑا خطرہ سمجھتا ہے، اسی لیئے وہ در پردہ طالبان والقاعدہ کے کچھ حصوں کی مدد کرتے ہیں اسی طرح روس کوشدید خطرات لاحق ہیں کہ امریکہ افغانستان میں طالبان کے مقابلے میں افغان حکومت کو مستحکم کرنے نہیں بلکہ مستقبل قیام کے لیئے آیا ہے افغانستان کا نائب صدر عبدالرشید دوستم اس وقت ترکی میں بیٹھا ہے افغان صدر اور نائب صدر ایک دوسرے کے سخت دشمن ہیں، اسی طرح افغان وزیر خارجہ کی صدر سے گذشتہ چھ سات ماہ سے بات چیت بند ہے، افغان حکومت اندرونی طور پر سخت انتشار کا شکار ہے۔ لہٰذا امریکہ یا یورپ اپنے طور پر کبھی بھی اس جنگ کو ختم نہیں کر سکتے جب تک اس خطے کے تمام اسٹیک ہولڈرز روس، چین، ایران، ترکی، پاکستان، بھارت شریک نہ ہوں۔

ایڈیٹر

اختر حسین

مجلسِ ادارت

عابد حسن منٹو

مسلم شمیم، صباء الدین صباء، توقیر چغتائی

عابد شکیل فاروقی

منیجنگ ایڈیٹر

اے. آر. عارف

سرکولیشن منیجرز

اشتیاق اعظمی

اس شمارے میں

ادار یہ

ٹرمپ افغان پالیسی نئی حکمت عملی	ادارہ	1
پاکستان میں زرعی اصلاحات پس منظر	اختر حسین	3
مردم شماری کے عبوری نتائج اور خدشات	اثر امام	8
جناب عابد حسن منٹو کا خصوصی انٹرویو	فرحان احمد خان	10
اقتدار کی جنگ	بابر ایاز	17
پاکستان کے ستر سال ریاست کا صنفی کردار	عصمت شاہ جہاں	18
سندھ میں سہ فریقی لیبر کانفرنس کیلئے تجاویز	ظہیر اختر بیدری	20
AWP کے صدر کا گلف ممالک کا دورہ	رپورٹ: عصمت شاہ جہاں	21
انجمن ترقی پسند مصنفین کراچی کی خصوصی رپورٹ	اے آر عارف	23
پاکستان میں سیکولرازم کا سوال	رپورٹ عابد شکیل	24

لاہور آفس: 5- میکلوڈ روڈ، لاہور، پاکستان

فون: 042-37353309-37357091

فیکس: 94-42-36361531

کراچی آفس: 204-201، پینوراما سینٹر نمبر 1، فاطمہ جناح روڈ، صدر کراچی

Email:awami.jamhuriat@gmail.com

کیا پاکستان امریکی تسلط سے آزاد ہو سکتا ہے؟

ڈونلڈ ٹرمپ کی نئی فوجی و سیاسی حکمت عملی نے پاکستان میں کھلبلی مچادی ہے، امریکی صدر کی ڈومور (Do More) پالیسی تو کوئی نئی نہیں مگر پاکستانی اسٹبلشمنٹ کے لیئے سب سے بڑی پریشانی بھارت کے مجوزہ کردار کی ہے جہاں اسے نہ صرف علاقائی طور پر معاشی بلکہ امن اور سلامتی کا بہت بڑا کردار سونپا گیا ہے۔ پاکستانی اسٹبلشمنٹ اور سیاسی حکمرانوں کے لیے یہ اچھنبے کی بات نہیں ہونی چاہیے کیونکہ 70 سال تک انہوں نے امریکی غلامی میں گذارے پہلے بغداد پیکٹ اوز سیٹو وسنٹو کے کمیونسٹ دشمن معاہدوں میں رہے لیکن آخر کار پہلے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور فیلڈ مارشل ایوب خان نے فرینڈز ناٹ ماسٹرز کتاب لکھی، دوسرے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحیٰی نے آدھا ملک گنوادیا مگر امریکیوں نے کوئی مدد نہیں کی، پھر پہلے سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور پہلے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اپنے قتل کا ذمہ دار ''سفید ہاتھی'' کو کہا، افغان ثور انقلاب اور سوویت یونین کے خلاف دس سال تک جنگ اور مجاہدین کی قیادت کے بعد جنرل ضیاء الحق اپنی موت سے پہلے کہنے پر مجبور ہوئے کہ ہم کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا کر رہے ہیں'' جنرل مشرف، جنرل اشفاق پرویز کیانی اور جنرل راحیل شریف بھی تزویراتی گہرائی کی اہمیت کے نام پر کم وبیش جنرل ضیاء الحق ہی کے نقش قدم پر چلتے رہے مگر نہ تو امریکی ڈرون حملے بند کرا سکے اور نہ ہی سلالہ اور ملالہ اور اسامہ بن لادن آپریشن میں انہیں پہلے خبردار کیا گیا۔ لیکن ان تمام تجربات کے بعد بھی ہماری اسٹبلشمنٹ اور حکمرانوں نے جنرل راحیل شریف کو امریکی سرپرستی میں سعودی عرب اور دیگر ممالک کی اتحادی افواج کا سربراہ بنانے کی منظوری دے دی، جس کے نتیجے میں عرب اور ایران کے درمیان تضاد اور علاقائی جنگی جنون کا ہم بالواسطہ حصہ بن گئے، کیا یہ فوجی اتحاد مکہ اور مدینے کے مقدس مقامات کے دفاع کے لیئے ہے یا سعودی بادشاہت اور عرب شیوخ کی حکمرانی کو بچانے کے لیئے، کیا امریکہ اور سعودی عرب کو نہیں معلوم کہ افغانستان میں جن 20 سے زیادہ دہشت گرد تنظیموں کا ذکر کیا جاتا ہے، ان میں تین چار کے علاوہ تمام وہابی اسلام سے جڑی ہیں اور زیادہ تر کی مالی معاونت سعودی عرب اور شیوخ کرتے ہیں، اس فوجی اتحاد میں داخل ہوکر ہمارے حکمرانوں نے پاکستان کو پراکسی جنگوں کا گڑھ بنادیا ہے اس سب کے باوجود ہمارے حکمران طبقات امریکہ کے ساتھ مذاکرات جاری رکھنے اور خیر کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔

لیکن موجودہ حالات میں جہاں روس، چین، سینٹرل ایشیائی ممالک، ایران وغیرہ ڈونلڈ ٹرمپ کی پالیسیوں سے ناراض ہیں اور اپنے علاقائی معاشی وسیاسی مفادات کے لیئے مخالفت کر رہے ہیں، وہیں پہلی دفعہ پاکستان کی پارلیمنٹ نے بھی متفقہ آواز اٹھائی ہے کہ ہمیں ٹرمپ پالیسی کی تابع داری کی بجائے جواب دینا چاہیے کہ ہم بہت کر چکے اور بھارت کے مقابلے میں ہمارے مفادات کا خیال رکھا جائے، چیف آف آرمی اسٹاف جنرل قمر جاوید باجوہ نے بھی کہا کہ ہمیں امریکی امداد نہیں چاہیے لیکن ہماری قربانیوں کو تسلیم کیا جائے، پاکستان کی اسٹبلشمنٹ اور پارلیمنٹ کا مؤقف اب بھی نیم دروں نیم بروں ہی ہے، امریکی تسلط سے آزاد ہونے کی خواہش تو نظر آتی ہے لیکن اس کا یقین بدلنا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کے لیئے ہمیں بنیادی طور پر اپنے ریاستی بیانے کے بدلنے کی ضرورت ہے، اس سے قبل بھی دہشت گردی کے خلاف نیشنل ایکشن پلان کا اعلان ہوا تھا جس میں فوری اور دور س اقدامات کا بیان کیا گیا تھا مگر NAP کہاں گیا، ہر دفعہ آرمی چیف کے بدلنے کے بعد نئے آپریشن کا اعلان ہوتا ہے کبھی ضرب عضب، کبھی ردالفساد مگر دہشت گردی کا مقابلہ اب بھی پورے ملک میں جاری ہے، ہم نے پہلے بھی کہا تھا کہ محض فوجی آپریشن سے دہشت گردی ختم نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کی بنیادیں مذہبی انتہا پسندی میں ہیں جس کی لاکھوں نرسریاں مذہبی اور فرقہ واری مدرسوں کی صورت میں قائم ودائم ہیں۔

تعلیمی نظام کی سیکولر (دنیاویت پسندی) کی بنیاد تبدیلی کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا، نہ ہر شخص کے لیئے لازمی دنیاوی تعلیم کی ریاست کے پاس کمٹمنٹ ہے، کہتے تو نہیں کہ حقانی نیٹ ورک کے ساتھ ہمارا تعلق نہیں مگر حقانی جہادی نیٹ ورک کی مادر علمی اکوڑا خٹک میں قائم اور اسی طرح سے جاری ہے اور ابھی بھی ان کے سربراہ جمعیت علماء اسلام کے مولانا سمیع الحق نے کہا ہے کہ حقانی ہمارے بچے ہیں جن کی حفاظت ان کا فرض ہے، ابھی اسٹبلشمنٹ جماعت الدعوۃ، لشکر طیبہ، کشمیر کے جہادی گروپ و تنظیمیں، دفاع پاکستان کونسل اور اس قسم کی بے شمار تنظیمیں نام بدل بدل کر ریاستی پشت پناہی میں کام کر رہی ہیں، ہمیں جموں کشمیر کے عوام کے سیاسی طور پر حق خودارادی کی حمایت کرتے ہوئے جہادی پالیسی اور کشمیر بنے گا پاکستان پالیسی کو بدلنا ہوگا، مغربی اور مشرقی دنیا اور اپنے دوستوں اور دشمنوں کے سامنے ثابت کرنا ہوگا کہ ہم نے اپنا پرانا ریاستی بیانہ بدل دیا ہے، اور ہماری اولیت معاشی ترقی ہے، علاقائی ممالک کے ساتھ دوستی و معاشی تعاون کا ہے اسی کے ساتھ سیاسی آزادی جڑی ہوئی ہے اور اپنے پاکستانی سماج میں بنیادی معاشی و سماجی تبدیلیوں اور خارجہ پالیسی کی پرانی بنیادوں کو بدل کر ہی ہم امریکی سامراج کے تسلط سے آزاد ہوسکتے ہیں۔

ایڈیٹر کے نام خط

ڈیر اختر خوش رہو!

''عوامی جمہوریت'' کا شمارہ نمبر 05 جلد نمبر 13 کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ بحیثیت مجموعہ شمارہ اچھا ہے اگر پروف ریڈنگ پر زیادہ وقت دیا جاتا تو اچھا تھا۔ اداریہ بہت اچھا ہے۔ نجم الحسن عطا کا مضمون بہت خوب ہے لیکن عنوان میں ''پانامہ لیک'' کا ذکر نامناسب سا ہے، ڈاکٹر توصیف احمد خاں کا الجزیرہ ٹیلیویژن پر مضمون شمارے کی جان ہے، آزادی صحافت پر توصیف صاحب کا کردار قابل فخر رہا ہے اور اس مضمون میں انہوں نے اپنا کردار اور بھی نمایاں کر دیا۔ ریاض احمد شیخ کا مضمون برطانیہ کے حالیہ پارلیمانی انتخاب اور لیبر پارٹی کا ابھرنا بہت اچھا لگا۔ اثر امام کا مضمون ''پاکستان میں جاگیردارانہ باقیات بالکل نئے انداز میں ہے، ہمیں اپنی سیاست بھی اسی انداز میں کرنی چاہیے کہ تمام زرعی زمین ریاست کی ہے، اس طرح وراثتی جھگڑے بھی ختم ہو سکتے ہیں۔ ہم اگلے شمارے کے منتظر ہیں۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

محمد حسین بلوچ (لالہ گل شیر)

پاکستان میں زرعی اصلاحات پس منظر

قانون اور آئینی نقطہ نظر سے

اختر حسین

کسی بھی ملک میں بنیادی سماجی تبدیلیوں اور کسی بھی طرح کی اصلاحات کے لیے عوام اور خاص طور پر سیاسی کارکنوں کا باشعور ہونا ضروری ہے اور یہ ایک ایسی سیاسی پارٹی کے بغیر ناممکن ہے جس کی جڑیں عوام میں ناپھیلی ہوں اور اس کے کارکن نہ صرف عوام کو بنیادی سماجی تبدیلیوں کے لیئے ذہنی طور پر تیار کریں۔ بلکہ ایسی اصلاحات کے عملی نفاد کے ساتھ کھڑے ہوں تا کہ اس کا فائدہ عوام کی وسیع تر آبادی کو مل سکے اور پورا سماج ترقی کی ایک سطح سے دوسری کی طرف بڑھ سکے، ماضی کے چالیس پچاس سال کے تجربات ہمارے سامنے ہیں کیونکہ ملک میں جس طرح کی بھی زرعی اصلاحات 60-1950 اور 1970 کی دہائیوں میں نافذ ہوئیں جن کی تفصیل آگے بیان کریں گے ان پر عمل درآمد حکمرانوں کی کمٹمنٹ نہ ہونے کے علاوہ عوامی سطح پر سیاسی پارٹی اور اس کے کارکنوں کی تنظیم نہ ہونا بھی ہے جو ان اصلاحات پر عوامی طاقت کے ذریعے عمل کرا سکے، بھارت میں جو بھی زرعی اصلاحات ہوئیں ان پر عمل درآمد حقیقت میں بائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں نے عوامی جدوجہد اور طاقت کے ذریعے کرایا اگر عوام میں ان اصلاحات کو قبول کرنے اور سیاسی پارٹی کی تنظیم نہیں ہوگی تو مخالف رجعتی قوتیں بہ آسانی اس کا فائدہ اٹھا کر رخ پلٹ سکتی ہیں، ہمارے سامنے اس کی بڑی مثال افغانستان کا 1978ء کا ثور انقلاب ہے، جس انقلاب کے پہلے پہلے حکم ناموں میں سود کا خاتمہ تھا جو سودی نظام افغان معاشرے میں اتنا گہرا تھا کہ لاکھوں کسان سود کے نیچے قوانین کے غلام تھے، اس حکم نامے نے کسانوں کو آزادی دلائی تھی، خواتین کی خرید و فروخت ختم کی تھی۔ تعلیم عورتوں اور مردوں کے لئے لازم قرار دی تھی، زرعی اصلاحات نافذ کی تھیں، مساجد میں معلم و موزن کی تنخوائیں مقرر کیں تھیں مگر انقلاب مخالف قوتوں نے افغان معاشرے کی قبائلی ساخت اور ماندگی کا فائدہ اٹھایا اور انقلاب کے مخالف کھڑا کر دیا، اس میں سامراجی ریشہ دوانیوں اور عملی امداد کے علاوہ سیاسی پارٹی کے اندرونی اختلافات اور عوامی سطح پر غیر منظم ہونا بھی ہے، میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قبائلی و جاگیری معاشرے کی تجارتی و صنعتی معاشرے اور سرمایہ دارانہ معاشرے کی سوشلسٹ معاشرے میں تبدیلی کے لیئے پیداواری قوتوں کے کردار کے علاوہ شعوری طور پر تبدیلی کے لیئے ایسی سیاسی پارٹی ضروری ہے جس کے کارکن سماجی سائنس کے علم سے لیس ہوں اور وسیع تر عوام کو شعوری طور پر اس کے لیئے تیار کریں۔

1947ء میں پاکستان کے قیام کے وقت یہاں بڑے بڑے زمیندار جاگیردار اور قبائلی سردار تھے جو ہزاروں، لاکھوں ایکڑ زمین کے مالک تھے، اور اس کی وجہ سے اپنا سماجی و سیاسی اثر رکھتے تھے۔ انگریز نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں لینڈ ڈ اسٹوکریسی قائم کی تھی، اور اسی لینڈ ڈ اسٹوکریسی کے ذریعے حکومت کرتے تھے، انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے پروگرام میں اس لینڈ ڈ اسٹوکریسی کے خاتمے اور بنیادی زرعی اصلاحات کا اعلان کیا تھا، لہٰذا اس مسلم لینڈ ڈ ارسٹوکریسی کا بڑا حصہ مسلم لیگ میں شامل ہو گیا، آزادی کے بعد یہی بڑا زمیندار طبقہ نہ صرف مسلم لیگ بلکہ ہمارے پورے سیاسی ڈھانچے پر چھایا ہوا ہے۔

پاکستان کے قیام سے ایک سال قبل 1946ء میں مسلم لیگ کی قیادت کا ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کراچی میں عبداللہ ہارون کے گھر منعقد ہوا جس میں لیاقت علی خان اور خلیق الزماں شامل تھے، اس اجلاس میں 1946ء میں ہونے والے عام انتخابات خصوصاً سندھ کے حوالے سے غور کیا گیا، مسلم لیگی قیادت سندھ میں جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے جبر اور ہاریوں کی انتہائی مخدوش حالت اور ان میں بے چینی سے واقف تھی، اس لیئے ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیئے زرعی اصلاحات کے مسئلے کو اٹھایا گیا اور قائداعظم کی ہدایات پر سر راجر تھامس کی سربراہی میں سندھ ہاری کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ایک رکن جناب ایم مسعود تھے، جو آٹھ سال تک بمبئی پریزیڈینسی میں اسسٹنٹ کلکیٹر اور پھر سندھ، نواب شاہ میں کلکیٹر رہے (ایم مسعود بعد میں مسعود کھدر پوش کے نام سے مشہور ہوئے) اس کمیٹی نے زرعی اصلاحات کے حوالے سے رپورٹ مرتب کر کے فروری 1948ء میں حکومت سندھ کو پیش کی مگر جناب ایم مسعود اس رپورٹ سے متفق نہیں تھے کیونکہ اکثریتی ممبران کی رپورٹ سے سندھ کی زرعی معیشت میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے تقریباً 79 صفحات پر مشتمل اپنا طویل اختلافی نوٹ لکھا، جس میں انہوں نے مقامی طور پر جاگیرداری اور بڑی زمینداریوں اور ان کے معاشی و سیاسی اثرات کا ذکر کیا اور ثابت کیا کہ قومی اور بین الاقوامی طور پر معاشی ترقی کے لیئے جاگیرداری نظام اور اس کی باقیات کا مکمل خاتمہ ضروری ہے، جس میں انہوں نے روس، جاپان، یوگوسلاویہ اور دیگر ممالک کی مثالیں دیں ان کے مطابق مذہب اسلام میں بھی زمین کی انفرادی ملکیت کا تصور نہیں ہے، زرعی زمین اس کی ہے جو کاشت کرتا ہے ان کے اختلافی نوٹ میں چند سفارشات مندرجہ ذیل ہیں۔

1- انقلابی اصلاحات کے ذریعے زمیندارانہ ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے، اسی سے ہاریوں، کسانوں کی وسیع آبادی کو جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے چنگل سے آزادی مل سکتی ہے۔

2- غیر حاضر زمینداری کا مکمل طور پر خاتمہ کردیا جائے اور زمین ہاریوں، کسانوں اور کاشت کاروں میں تقسیم کردی جائے، تقسیم کے لیے حد اور ضروری قوانین تشکیل دیئے جائے۔

3- بیراج کی زمین بھی بے زمین کسانوں میں تقسیم کی جائے۔

4- زمین کی کسی بھی قسم کی لیز پر مکمل پابندی، کیونکہ ملکیت اسلام کے خلاف ہے۔

5- کوئی بھی کسان اس وقت تک زمین اپنے قبضے میں رکھ سکتا ہے جب تک وہ خود کاشت کرتا ہے، وہ ہمیشہ کے لیئے مالک نہیں ہوسکتا۔

6- زمین کی مالک ریاست ہوگی اور وہ کاشتکاروں کو کاشت کی سہولت اور ذرائع پیداوار مہیا کرے گی۔

7- جن زمینداروں سے زمین لی جائے ان کو معاوضے کا تعین ریاست کرسکتی ہے۔

8- ریاست ان اصلاحات پر عمل درآمد کیلئے قانون سازی کرے اور عملی اقدام اٹھائے

حکومت سندھ نے دسمبر 1948ء میں ہاری کمیٹی کی اکثریتی رپورٹ تو عام کی مگر جناب ایم مسعود کے اختلافی نوٹ اور تجاویز شائع کرنے سے نہ صرف انکار کردیا بلکہ ایک حکم نامے کے ذریعے پابندی لگادی، جس کے نتیجے میں ہاریوں اور ترقی پسند سیاسی کارکنوں میں بے چینی پھیل گئی اور اس کو شائع کرنے کے لیئے احتجاج شروع ہوگیا۔ حکومت سندھ کے فیصلے کی زمینداروں اور انگریزی (سوائے ڈان) اور سندھی پریس نے مکمل حمایت کی بلکہ زمینداروں نے علماء سے فتوے جاری کرائے کہ جناب ایم مسعود کا اختلافی نوٹ اور زرعی اصلاحات کی تجاویز خلاف اسلام ہیں۔ جن میں مولانا عبدالحمید بدایونی کا فتویٰ قابل ذکر ہے انہوں نے کہا کہ ایم مسعود کمیونسٹ ہے اور انکی رپورٹ اسلام کے خلاف ہے جس پر پابندی لازم ہے، لیکن اس رپورٹ کے حوالے سے سندھ میں احتجاج جاری رہا، بلآخر 20 جون 1949ء کو یوسف ہارون کی وزارت اعلیٰ نے (جو خود زمیندار طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے) جناب ایم مسعود کے اختلافی نوٹ کو شائع کرنے کی اجازت دے دی، مگر سندھ میں جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے سیاسی اثرات کی وجہ سے زرعی اصلاحات کا کوئی قانون نافذ نہ ہوسکا۔

مشرقی پاکستان کی زرعی اصلاحات:

آزادی کے بعد سب سے پہلے مشرقی پاکستان میں جناب نورالامین کی وزارت اعلیٰ کے دور میں صوبائی حکومت نے East Pakistan Estate acquisition & Tenancy Act، 1951 میں پاس کیا جس کے تحت انگریز کی قائم کردہ لینڈ ڈارسٹوکریسی کا مکمل خاتمہ کردیا اور زرعی زمین کی 130 ایکڑ حد ملکیت قائم کرکے بنیادی زرعی اصلاحات نافذ کیں اور غیر حاضر زمینداری ختم کردی بھارت میں بھی اسی طرح سے 1953 میں بنیادی زرعی اصلاحات کے ذریعے بڑی زمینداریاں ختم کردی گئیں، مشرقی پاکستان کی زرعی اصلاحات کا اثر یہ ہوا کہ مغربی پاکستان کے جاگیردار طبقے اور نوکرشاہی نے گٹھ جوڑ سے ایسی سیاسی منصوبہ بندی شروع کی کہ مشرقی پاکستان کی عددی اکثریت پاکستان کی سیاست و معیشت پر بالادستی نہ قائم کرسکے، ون یونٹ کا قیام اور پیریٹی سسٹم اس منصوبہ بندی کا حصہ تھا اور طویل سیاسی جدوجہد کے بعد جب 1969ء میں ون یونٹ ٹوٹا اور ایک فرد ایک ووٹ کے اصول کو پہلی دفعہ تسلیم کرتے ہوئے 1970 میں عام انتخابات ہوئے تو اس کے نتیجے مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کی قومی اسمبلی میں اکثریت کے باوجود اس کو اقتدار دینے سے انکار کرکے مشرقی پاکستان کو الگ کردیا گیا اور بنگلہ دیش بن گیا اور اس طرح مغربی پاکستان اور موجودہ نئے پاکستان میں بڑے زمیندار طبقے نے اپنی سماجی و سیاسی بالادستی قائم رکھی۔

میاں ممتاز دولتانہ حکومت کی اصلاحات:

مغربی پاکستان میں 1951ء میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور میاں ممتاز دولتانہ کی حکومت قائم ہوئی، 1952ء میں گورنر پنجاب نے زرعی شعبے سے متعلق ایک آرڈیننس پاس کیا جس کے تحت کسی مزارع کو زمین کی مزارعت سے بے دخل کرنے پر مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ پابندی لگائی۔

1- بٹائی نہ دے

2- زمین کو دیئے گئے مقررہ مقصد کے علاوہ کاشت نہ کرے

3- کسی قسم کی سیاسی اور زراعت سے متعلق تحریکوں میں حصہ نہ لے

گوکہ زمینداروں کے لیئے مشکل نہ تھا کہ ان شرائط کا بہانہ بنا کر بے دخلی کریں مگر پھر بھی اس حکم نامے کا خاصہ اثر ہوا، اس کے بعد میاں ممتاز دولتانہ کی حکومت نے 1953ء میں مزید زرعی اصلاحات کا قانون پاس کیا، جس کے تحت زمین کی حد ملکیت قائم کیئے بغیر کہا گیا کہ

1- موروثی مزراعین آدھی قیمت ادا کرکے اپنے زیر کاشت زمین کے مالک بن سکتے ہیں

2- آئندہ کے لیئے موروثیت کا حق ختم کردیا گیا۔

3- ٹبائی میں مزراع کا 5/2 حصہ ہوگا۔ مالیہ مالک دے گا اور کھاد بیج مزراع۔

4- سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کی پابندی ختم کردی گئی۔

اس کے بعد ملک میں کئی حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں، 1956ء کا آئین بھی تشکیل پایا مگر زرعی اصلاحات کے متعلق مغربی پاکستان میں کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔

ایوبی مارشل لاء اصلاحات:

1958ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا اور اس مارشل لائی حکومت نے پہلی دفعہ زرعی اصلاحات کا قانون West Pakistan 1959 Land Reform Regulation نافذ کیا، ان زرعی اصلاحات کے تحت 500 ایکڑ نہری اور 1000 ایکڑ بارانی زمین یا 36000 PIU پروڈیوس انڈیکس یونٹ فی کس رکھنے کی حد ملکیت قائم کی، اس کے علاوہ زمیندار شکارگاہیں اور چراگائیں لامحدود تعداد میں رکھ سکتے تھے۔ زائد زمین مزارعوں اور ہاریوں میں تقسیم کرنے کا اعلان ہوا، حاصل ہونے والی زمین کا معاوضہ سرکار نے 8 روپے فی ایکڑ مالکان کو دیا اور مزارعوں اور ہاریوں سے قسطوں میں وصول کیا گیا۔ ریکارڈ کے مطابق ان اصلاحات کے ذریعے 21 لاکھ ایکڑ زمین حاصل ہونا تھی جو تقریباً 19 لاکھ ایکڑ حاصل ہوئی مگر اس میں قابل کاشت رقبہ صرف 5 لاکھ ایکڑ تھا، باقی بنجر پتھریلی اور ناقابل کاشت زمین تھی مگر زمینداروں نے اس کا معاوضہ سرکار سے وصول کرلیا، ان زرعی اصلاحات سے بڑی زمینداری تو ختم نہیں ہوئی مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمین کی حد ملکیت قائم کرنے اور زرعی اصلاحات کی شروعات ہوئیں۔

ذوالفقار علی بھٹو حکومت اصلاحات:

1971 میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ذوالفقار علی بھٹو باقی ماندہ پاکستان کے پہلے سیویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے تو انہوں نے 1972 میں دوسرا زرعی اصلاحات کا قانون Land Reform Regulation 1972 جاری کیا، جس کے تحت 1959 کا قانون منسوخ کرتے ہوئے زرعی زمین کی نئی حد ملکیت قائم کی، اس قانون کے تحت 150 ایکڑ نہری اور 300 ایکڑ بارانی یا 15000 PIU (پروڈیوس انڈکس یونٹ) فی کس زمین رکھنے کی حد مقرر کی، اس کے علاوہ ٹریکٹر اور ٹیوب ویل کے لیئے 20 ایکڑ نہری یا 2000 PIU رکھنے کی بھی اجازت تھی، مزید عزیز واقارب کو عطیے میں زمین دے سکتے ہیں، سرکاری ریکارڈ کے مطابق ان اصلاحات کے تحت 28 لاکھ ایکڑ زمین حاصل ہونا تھی، جو صرف 8 لاکھ ایکڑ حاصل ہوئی، وہ بھی زیادہ تر نا قابل کاشت ان اصلاحات میں بھی اتنے سوراخ مہیا کیئے گئے کہ حقیقت میں حد ملکیت اور خاندانی قبضہ پر کوئی خاص فرق نہ پڑا، مگر ان اصلاحات کی اہم بات یہ ہے کہ حاصل کی گئی زمین مزارعوں/ ہاریوں میں مفت تقسیم ہوئی، مزارعوں کو حق سفعہ دیا گیا اور گھر بنانے کے لیئے 5 مرلہ اسکیم نافذ کی گئی جس نے مزارعوں/ ہاریوں کو کسی حد تک اپنے ہونے کا اعتماد دیا اور زرعی معاشرے میں جمود ٹوٹا اور ہل چل شروع ہوگئی۔

1973ء میں ملک کا آئین پاس ہوا آئین کسی ملک کی وہ بنیادی قانونی دستاویز ہے جو ملک کی جغرافیائی، معاشی، سیاسی سماجی، تنظیمی ساخت کا مظہر ہوتا ہے اس کے تحت ریاست اور اس کا پورا نظام تشکیل پاتا ہے، زندگی کے مختلف شعبوں اور ضروریات کی قانون سازی ہوتی ہے، دنیا کے مختلف تحریری آئینی، دستاویزات کا تاریخی طور پر تجزیہ کریں تو اس وقت کے اراکین پارلیمنٹ اور سیاسی پارٹیاں جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں ان کے نظریات اور معاشی وسیاسی پروگرام کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی طرح 1973 کے آئین میں سب سے پہلے بڑا کردار پاکستان پیپلز پارٹی کا تھا جس کی پارلیمنٹ میں دوتہائی سے زیادہ اکثریت تھی، اس کا نظریہ تین نعروں پر تھا۔

1- جمہوریت ہماری سیاست ہے

2- سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

3- مذہب ہمارا اسلام ہے۔

اصل آئین انہی تین نعروں کا ملغوبہ ہے یا ان کے گرد گھومتا ہے۔

یعنی آرٹیکل 1- پاکستان فیڈرل پارلیمنٹری ریپبلک

آرٹیکل 2- ریاست کا مذہب اسلام

آرٹیکل 3- استحصال کا خاتمہ/ سوشلسٹک، یعنی لکھا ہے کہ

"ریاست اس بنیادی اصول کے تحت کہ ہر شخص سے اس کی قابلیت یعنی علم وہنر کے مطابق کام لیا جائے اور اس کے کام کے مطابق معاوضہ دیا جائے یہ یقینی بنائے گی کہ استحصالی کی تمام شکلوں کا خاتمہ کردیا جائے"۔

عملی طور پر اسلام کے حوالے سے آرٹیکل 227 تا 231 میں یعنی اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل جس میں تمام فرقوں کے علماء اور ماہر قانون شامل ہونگے اور اگر کوئی قانون یا شق قرآن وسنت سے متصادم ہے تو وہ غور کر کے سفارشات حکومت اور پارلیمنٹ کو ارسال کریں گے البتہ قانون بنانا یا ترمیم کرنا پارلیمنٹ کا کام ہے یعنی پارلیمان کا اقتدار اعلیٰ قائم ہے۔

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جس طرح استحصال سے پاک معاشرے کے قیام کے لیئے آئین وقوانین کی دنیاویت پسندی یا سیکولرزم پر بنیادیں ضروری ہیں اسطرح وفاقی ملک میں مختلف وفاقی اکائیوں یا قوموں کی خودمختیاری یا کم از کم اپنے معاشی وسائل پر قدرت رکھنا بھی ضروری ہے، جن اصولوں کی اس آئین میں نفی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وفاق اور صوبوں کے درمیان کش مکش جاری ہے اور آج تک نہ جمہوریت مستحکم ہوئی ہے نہ استحصال کے خاتمے کی طرف پیش رفت اور ریاست کی مذہب پر بنیاد نے نہ صرف مذہبی تنگ نظری، فرقہ پرستی اور انتہا پسندی کو جنم دیا ہے بلکہ ملک کی بنیادوں کو ہی کھوکھلا کردیا ہے۔

وفاق اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی کشمکش نے نیشنل عوامی پارٹی (NAP) اور پاکستان پیپلز پارٹی (PPP) کے درمیان تصادم کی شکل اختیار کی، نتیجتاً ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خلاف بڑی تحریک نے جنم لیا، تو انہوں نے 1977 میں دوسری زرعی اصلاحات جاری کرنے کا قانون یعنی Land Reform Act 1977 پاس کیا۔ جس کے تحت زیادہ سے زیادہ 100 ایکڑ نہری اور 200 ایکڑ بارانی یا 8000 PIU (پروڈیوس انڈکس یونٹ) فی کس کی حد ملکیت قائم کردی مگر ان اصلاحات پر کسی طرح کا عمل درآمد نہ ہوسکا کیونکہ 5 جولائی 1977 کو ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا ملک میں پھر جنرل ضیاءالحق کی سربراہی میں مارشل لاء نافذ ہوگیا۔

جنرل ضیاءالحق کی قانون سازی وآئینی ترمیم:

جنرل ضیاءالحق جنہوں نے اقتدار سنبھالتے وقت حلفیہ طور پر اعلان کیا تھا کہ ان کا مقصد صرف 90 روز میں انتخاب کرانا ہے مگر ملک میں 10 سال تک اقتدار پر قابض رہتے اور طیارے کا حادثہ نہ ہوتا تو مزید قابض رہتے انہوں نے پہلے تو 1979 میں Land Reform Amenament Ordinance جاری کیا، جس کے تحت اگر کوئی زمین 1977ء کی زرعی اصلاحات کے قانون کے تحت لی گئی ہے اور صوبائی حکومت اس کو لیز کرنا چاہتی ہے تو جس شخص سے یہ زمین لی گئی ہے اس کا پہلا حق ہے کہ خرید لے، اس سے استثناء صرف کوآپریٹو سوسائٹیوں اور تعلیمی اداروں کو ہوگا اس طرح سے دیگر آئینی ترامیم سے پہلے ہی انہوں نے زرعی اصلاحات اور بڑی زمین داریوں کے خاتمے کا راستہ بند کردیا۔

1980ء سے جنرل ضیاءالحق نے آئینی ترامیم کرنا شروع کیں، انہوں نے سامراجی پالیسیوں کے عین مطابق اور سماج کو جوں کا توں رکھنے کے لیئے مذہب کو ہی سب سے بڑا ہتھیار بنایا بلکہ رجعت پرستی اور پس ماندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں لے گیا، آئینی ترمیم کے ذریعے آئین میں ایک نیا باب 3-A اور آرٹیکلز 203-A تا 203-J فیڈرل شریعت کورٹ کے اختیار آئین کی بنیادوں اور بین الاقوامی طور پر طے شدہ پارلیمانی جمہوریت کے مسلّمہ اصولوں کے ہی خلاف ہیں، آرٹیکل 203-D شرعی عدالت کو اختیار دیتا ہے کہ کوئی شہری حکومت درخواست کے ذریعہ کسی قانون کو چیلنج کرسکتے ہیں یا عدالت ازخود کسی قانون یا شق کا جائزہ لے سکتی ہے کہ آیا وہ قرآن وسنت سے متصادم تو نہیں اور اگر ایسا ہے تو فیصلہ کرے گی کہ اس کو مقررہ مدت میں ختم کیا جائے یا ترمیم کی جائے اور اگر صدر مملکت یا صوبائی گورنر عدالت کی ہدایت کے مطابق اقدامات

نہیں اٹھاتے اور پارلیمان ترمیم نہیں کرتی تو مقررہ مدت پوری ہونے کے بعد عدالتی حکم ازخود ملک کا قانون بن جائیگا، یہ اختیار نہ صرف آئین کی بنیادی روح اور پہلے سے طے شدہ آئینی شقوں اور اصولوں کے خلاف ہے بلکہ پارلیمان کے مقتدر اعلیٰ ہونے کا ہی خاتمہ کر دیتا ہے، یعنی قانون بنانے یا تبدیلی کرنے کا اختیار پارلیمان کی بجائے دو مولویوں اور ایک جج کو دیا گیا ہے۔ ہماری سیاسی پارٹیاں جو ضیاء الحق کے بڑے خلاف ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں اور اٹھارویں آئینی ترمیم کو جمہوریت کا بہت بڑا حاصل سمجھتی ہیں انہوں اس آئینی شق کو نہیں چھیڑا حالانکہ یہ آئین میں پہلے سے دی گئی اسلامی شقوں کے بھی خلاف ہے۔

اس وفاقی شرعی عدالت نے 1980 سے آج تک سود کے بارے میں تو فیصلہ نہیں کیا کہ اس کی تعریف ہی کیا ہے حالانکہ یہ معاملے اس وقت سے ایک پٹیشن کے ذریعے عدالت کے زیر غور ہے، مگر اس عدالت کی سپریم کورٹ کی اپیل بینچ نے قزلباش وقف کی درخواست پر کہ ملک میں زرعی اصلاحات خلاف قرآن وسنت ہیں، کثرت رائے سے فیصلہ دیا کہ 1972ء اور 1977ء میں نافذ کی گئی زرعی اصلاحات کے قوانین قرآن وسنت سے متصادم نہیں اور ان قوانین کو کالعدم قرار دے دیا (اپیل بینچ کا فیصلہ PLD-1990-SC-99 میں رپورٹ ہے) جس کے نتیجے میں ان اصلاحات کے تحت بڑے بڑے زمینداروں سے لی گئی زمین (جو زیادہ تر پہلے ہی کاغذات میں تھیں) ان کو واپس ہو گئیں، اور ہم زرعی اصلاحات کے حوالے سے ابھی بھی 1947 میں کھڑے ہیں کیونکہ 1959ء کے زرعی اصلاحات کے قانون کو 1972 کے قانون نے ختم کر دیا تھا۔ حالانکہ اقلیتی رائے والے جج مرحوم ڈاکٹر نسیم حسن شاہ نے قرآن پاک کی آیت کے حوالے سے فیصلہ لکھا کہ زمین وآسمان کا مالک اللہ ہے اور اس کے بعد وہ جو زمین پر ہل چلاتا ہے یعنی خود کاشت کرتا ہے اور اپیل بینچ سے پہلے شریعت عدالت نے بھی فیصلہ دیا تھا کہ نہ تو انہیں یہ مقدمہ سننے کا اختیار ہے اور نہ ہی یہ اصلاحات قرآن وسنت سے متصادم ہیں (شریعت عدالت کا فیصلہ PLD-1981-FSC-23 میں رپورٹ ہے)، آپ ذرا غور کریں کہ شریعت عدالت کے علماء اور جج اور اپیل بینچ کے اقلیتی رائے رکھنے والے جج بھی قرآن وسنت کی روشنی میں ہی فیصلہ دیتے ہیں کہ زرعی اصلاحات اسلام کے خلاف نہیں ہیں عمومی طور پر مذہبی علماء میں اس بات پر اتفاق ہے کہ زرعی اصلاحات ضروری ہیں اور خلاف اسلام نہیں مگر اپیل بینچ کی اکثریتی رائے سے قانون نافذ ہو جاتا ہے اسی لیئے بین الاقوامی طور پر قانون کے فلسفے میں یہ طے شدہ اصول ہے کہ قانون بنانا پارلیمان کا کام ہے اور عدالتیں صرف تشریح کرتی ہیں، مگر جنرل ضیاء الحق کی جاری کی گئی یہ آئینی ترامیم ایک عجوبے سے کم نہیں جو سماج کو ترقی کی طرف لے جانے کی بجائے پیچھے اندھیروں کی طرف لے جاتی ہے، اور خلق خدا کو معاشی وسیاسی طور پر مزید پس ماندہ کر دیتی ہے۔

ہم ملک میں جہاں جاگیری باقیات اور بڑی زمینداریوں کے خاتمے اور زرعی اصلاحات کے لیئے جدوجہد کر رہے ہیں اور سپریم کورٹ کی شریعت اپیل بینچ کے فیصلے کے خلاف آئینی اور محنت کش عوام کے مفادات کے خلاف ہونے پر رائے عامہ ہموار کر رہے ہیں وہیں میں نے ورکرز پارٹی کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے سپریم کورٹ میں آئین کے آرٹیکل (3) 184 کے تحت پٹیشن (CP No. 97/2011) داخل کی ہے جس میں جناب عابد حسین منٹو اور بلال منٹو ہمارے وکیل ہیں جس میں شریعت کورٹ کے مذکورہ فیصلے کو چیلنج کیا گیا ہے ہم نے یہ پٹیشن اسلامی بنیادوں پر داخل نہیں کی بلکہ یہ کہا ہے کہ زرعی اصلاحات کو آئین کے آرٹیکلز 24 اور 253 کے تحت تحفظ حاصل ہے اور شریعت عدالت کو قزلباش وقف کی درخواست کو سننے کا اختیار ہی حاصل نہیں تھا، لہٰذا اس فیصلے کو کالعدم قرار دیا جائے، اس پٹیشن میں بہت ساری دیگر پارٹیاں بھی ہماری رائے سے اتفاق کرتی ہیں اور ان کی طرف سے بھی بیان داخل ہوئے ہیں بلکہ بعض اس پٹیشن میں ہمارے ساتھ شامل ہیں، جاگیردارانہ مفادات کی پارٹیاں اور گروپ اپنے مفادات کے لیئے خلاف ہیں مگر چھ سال کا عرصہ گذر گیا ہے، اور ہم نے ہر چیف جسٹس سے جا کر ذاتی درخواست بھی کی ہے کہ یہ مقدمہ باقی مقدمات سے زیادہ عوامی مفادات کا حامل ہے جسمیں کروڑوں کسانوں، ہاریوں، کھیت، مزدوروں کا مفاد شامل ہے اور پورے سماج کی ترقی کا مسئلہ ہے، مگر ہمارے مقدمے کو نہیں سنا جا رہا ہے، سپریم کورٹ کو پانامہ لیکس، کرپشن یا دوسرے اسکینڈلز کو سننے سے فرصت نہیں ہے میرے خیال میں ہمیں اس کے لیئے بھی عوامی جدوجہد کرنی پڑے گی کہ سپریم کورٹ یہ عوامی اہمیت کا مقدمہ سنے۔

جنرل پرویز مشرف کی قانون سازی:

فیلڈ مارشل ایوب خان کے نافذ کردہ پہلے مارشل لاء اور 1972 کی زرعی اصلاحات کے بعد ہر فوجی آمر نے زرعی اصلاحات کے خلاف رکاوٹیں کھڑی کیں اور زمیندار طبقے کے معاشی، سماجی اور سیاسی مفادات کو مزید مضبوط کیا کیونکہ فوج خود زرعی، تجارتی و صنعتی مفادات میں شامل ہوتی چلی گئی، جنرل پرویز مشرف نے 1999ء میں اقتدار سنبھالا اور 2001 میں انکم ٹیکس کا نیا قانون نافذ کیا، انگریزی دور کے انکم ٹیکس قانون میں ایک باب زرعی آمدنی کا تھا، بعد میں زرعی آمدنی کو انکم ٹیکس سے چھوٹ دے دی گئی مگر جنرل مشرف کے دیئے گئے قانون میں زرعی آمدنی کے باب کو ہی ختم کر دیا گیا جیسے کہ زرعی آمدنی، آمدن کے زمرے میں ہی نہیں آتی، جس کے نتیجے میں زراعت سے متعلق لوگوں کی لامحدود آمدن انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

دوسرا 2007 میں Corporate Farming Act نافذ کیا گیا جس کے تحت بڑی اراضی ان پاکستان یا بیرونی کمپنیوں کو لیز کرنے کا اختیار دیا گیا، ان کمپنیوں کو کم سود پر قرضوں اور زرعی مشنری درآمد کرنے پر ٹیکس کی چھوٹ دی گئی، وہ اپنی مرضی کی کاشت کر کے فصل یا آمدنی بیرون ملک لے جاسکتے ہیں، اسطرح زرعی شعبے میں دیہات کے غریبوں، کسانوں، ہاریوں کھیت مزدوروں کو زمین الاٹ کرنے اور انکی معاشی وسماجی ترقی کی بجائے مقامی اور بیرونی سرمایہ کاروں کی لوٹ مار کا نیا راستہ کھولا گیا ہے، اس قانون کی روشنی میں پورے ملک میں 91 لاکھ ایکڑ زمین کی نشاندہی کی گئی ہے جو چاروں صوبوں میں ان کمپنیوں کو لیز کی جاسکتی ہے، جن علاقوں یا اضلاع کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں:

- ☆ پنجاب میں: ڈیرہ غازی خان، بہاولپور، راولپنڈی اور لاہور
- ☆ سندھ میں: میر پور خاص، سانگھڑ، حیدر آباد اور لاڑکانہ
- ☆ خیبر پختونخواہ میں: ڈیرہ اسماعیل خان، ہزارہ اور کوہاٹ
- ☆ بلوچستان میں: قلات، کوئٹہ، نصیر آباد اور مکران

ہماری جدوجہد

اس لیئے ہمیں ملک میں بنیادی زرعی اصلاحات کے ذریعے حد ملکیت 125 ایکڑ

نہری اور 50 ایکڑ بارانی فی کاشت کار خاندان کے طور پر مقرر کرنے، فالتو زمین بے زمین کسانوں، مزارعوں ہاریوں اور کھیت مزدوروں میں مفت تقسیم کرنے کے ساتھ انہیں آسان اقساط پر قرضوں اور سستی زرعی مشنری دینے کے مطالبات زرعی آمدنی پر فوری انکم ٹیکس نافذ کرنے اور Corporate Farming Act 2007 کی منسوخی غیر حاضر زمینداری کے خاتمے اور خود کاشت کے علاوہ زرعی زمین کی الائمنٹ پر پابندی عائد کرنے کی جدوجہد کرنی ہے۔

مغلیہ اور انگریزی دور کے جاگیرداروں اور بڑے زمیندار خاندانوں کے علاوہ پاکستان بننے کے بعد غیر حاضر زمینداروں کا نیا طبقہ فوجی افسران کا ہے، انگریزی دور میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں اعلیٰ کارکردگی اور بہادری کے انعام کے طور پر فوجی افسران کو زمین الاٹ کی جاتی تھی، مگر اس کے بعد تو ایک سلسلہ شروع ہوا پہلے بیراج ایریا میں الاٹمنٹ کی گئیں پھر سندھ اور پنجاب میں فوجی افسران کو وسیع پیمانے پر نہ صرف شہری علاقوں میں رہائش اسکیموں بلکہ زرعی زمین کی الاٹمنٹ کا لا متناہی سلسلہ شروع ہوا، بلکہ پنجاب میں تو بڑے بڑے جنگلات کا خاتمہ کر کے بہترین زرعی زمین فوجی افسران کو سینکڑوں ایکڑ کے حساب سے الاٹ کی گئی، پرویز مشرف کے دور میں پیر ووال کے جنگلات کی الاٹمنٹ حالیہ مثال ہے، الاٹمنٹ کے بعد یہ افسران زمین ٹھیکے پر دے دیتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں کی ٹیکس فری آمدنی لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فوج کے زیر انتظام زرعی فارمز ہیں پنجاب میں 50,127 ایکڑ بہترین زرخیز زرعی رقبہ فوج کے زیر انتظام ہے، جس میں 12,119 ایکڑ وفاقی حکومت کا ہے اور باقی پنجاب حکومت کا ہے بڑے بڑے ملٹری فارمز میں:

اوکاڑا	17.013	ایکڑ
رینالہ	3.115	ایکڑ
بھنگالی لاہور	4.341	ایکڑ
پروبنا	10,433	ایکڑ
پاکپتن	5.022	ایکڑ

ان فارمز کی زمینات وفاقی حکومت اور صوبائی حکومت نے لیز پر ملٹری فارمز اور آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کو دی تھیں جو لیز کی مقررہ مدت ختم ہوگئی مگر وفاقی حکومت کے زیر کنٹرول زمین جیسے بھنگالی لاہور فارمز فوج کو مفت الاٹ کر دی ہیں، مگر پنجاب حکومت کے زیر انتظام لیز ختم ہونے کے باوجود فوج دعویدار ہے اور مزارعین کو غیر قانونی طور پر بے دخل کیا جا رہا ہے، اور مزارعین کی اپنے موروثی حقوق کی جدوجہد جاری ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ان فارمز کی زمین مزارعین کو مفت الاٹ ہونی چاہیے کیونکہ بنیادی اصول کے طور پر زمین اسی کی ہے جو کاشت کرتا ہے، لہٰذا اس بڑے زمین دار طبقے کے علاوہ فوجی جنتا اپنے معاشی مفادات کے تحت ملک میں زرعی اصلاحات میں بڑی رکاوٹ ہے۔ زرعی اصلاحات کا ایک اور پہلو جس کو سب نظر انداز کرتے ہیں وہ اپر پنجاب کا بڑا حصہ جہاں بڑی زمینداریاں نہیں ہیں اور لوگ چھوٹے چھوٹے زمین کے قطعات کے مالک ہیں، یعنی گجرانوالہ سے اوپر گجرات، جہلم، چکوال، راولپنڈی، اٹک، میانوالی وغیرہ یہ چھوٹے کسانوں کا پنجاب ہے جہاں ان کی زمین چھوٹے قطعات میں بکھری ہے یعنی اشتمال اراضی نہیں ہوئی پنجاب ریونیو قانون کے تحت اگر 80 فیصدی دیہات کے کسان لکھ کر دیں تو اشتمال ہو سکتا ہے مگر کسانوں میں سیاسی شعور کی کمی اور سماجی پس ماندگی ہے وہ لکھ کر نہیں دیتے کیونکہ ان کے خیال میں انکی بہتر زمین کا ٹکڑا بااثر زمیندار لے جائیں گے، لہٰذا اشتمال اراضی قانوناً ہونی چاہیے تا کہ کسی کی چند ایکڑ زمین ایک جگہ جمع ہو جائے تو وہ ٹریکٹر سے کاشت کرا سکتا ہے یا ٹیوب ویل لگا سکتا ہے اور اسکی آمدنی بہتر ہو جائیگی لیکن ہمارے حکمرانوں کے پاس عوامی مفاد کی اتنی کمٹمنٹ بھی نہیں ہے کہ اس قسم کی اصلاحات بھی نافذ کر سکیں جسمیں غریب کسانوں کی معاشی حالت قدرے بہتر ہو۔

زرعی اصلاحات کے یہ سوالات صرف محنت کش طبقے کی سیاست کرنے والی پارٹی ہی اٹھا سکتی ہے، جو پاکستان میں بنیادی سماجی تبدیلی لانا چاہتی ہے جس کا منتہائے مقصود ملکی اور عالمی سطح پر ایک ایسے سماج کا قیام ہے، جس میں ہر شخص سے اس کے علم و ہنر کے مطابق کام لیا جائے اور اس کے کام کے مطابق معاوضہ دیا جائے اور بالآخر انسان کا انسان کے ہاتھوں استحصال کا خاتمہ ممکن ہو۔

☆☆☆

بقیہ سہہ فریقی کانفرنس

کر کے جاگیردارانہ نظام کو ختم کر دیا، لیکن پاکستان غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جہاں ابھی تک جاگیردارانہ نظام نہ صرف موجود ہے بلکہ سیاست اور اقتدار پر بھی اس کا تسلط قائم ہے۔ اگر لیبر کانفرنس میں ہاریوں کے حوالے سے مزدور قوانین کے اطلاق کے بجائے زرعی اصلاحات کا مطالبہ کیا جاتا تو یہ مطالبہ زیادہ منصفانہ اور منطقی ہوتا ہے۔ اس حوالے سے اس تحقیق کی البتہ ضرورت ہے کہ پاکستان میں جاگیرداروں کی ملکیت میں ابھی تک کس قدر زرعی زمین موجود ہے کیونکہ ایوب خان اور بھٹو کے دور میں ہونے والی زرعی اصلاحات کو جاگیرداروں اور وڈیروں نے ناکام بنا دیا تھا کیونکہ اوقاف میں جاگیردار اقتدار کا حصہ اور بیوروکریسی کے مالک تھے، اس کانفرنس میں پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کی طرف PTUF سندھ کے جنرل سیکریٹری روشن کلہوڑو، اثر امام اور منیر کنبر نے بھی شرکت کی۔

☆☆☆

بقیہ سہہ فریقی لیبر کانفرنس

کر کے جاگیردارانہ نظام کو ختم کر دیا، لیکن پاکستان غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جہاں ابھی تک جاگیردارانہ نظام نہ صرف موجود ہے بلکہ سیاست اور اقتدار پر بھی اس کا تسلط قائم ہے، اگر لیبر کانفرنس میں ہاریوں کے حوالے سے مزدور قوانین کے اطلاق کے بجائے زرعی اصلاحات کا مطالبہ کیا جاتا تو یہ مطالبہ زیادہ منصفانہ اور منطقی ہوتا ہے۔ اس حوالے سے اس تحقیق کی البتہ ضرورت ہے کہ پاکستان میں جاگیرداروں کی ملکیت میں ابھی تک کس قدر زرعی زمین موجود ہے کیونکہ ایوب خان اور بھٹو کے دور میں ہونے والی زرعی اصلاحات کو جاگیرداروں اور وڈیروں نے ناکام بنا دیا تھا کیونکہ جاگیردار اقتدار کا حصہ اور بیوروکریسی کے مالک تھے، اس کانفرنس میں پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کی طرف PTUF سندھ کے جنرل سیکریٹری روشن کلہوڑو، اثر امام اور منیر کنبر نے بھی شرکت کی۔

مردم شماری کے عبوری نتائج اور خدشات

اثر امـــام

انیس برس بعد ملک میں مردم شماری کا عمل تکمیل کو پہنچا اور اس کے عبوری نتائج کا اعلان کر دیا گیا ہے جو بہت زیادہ ڈراؤنے ہیں۔لیکن نتائج کے اس خطرناک پہلو پر کم ہی لوگوں نے غور کیا ہے۔زیادہ تر لوگوں کو تو الٹا اس بات پر اعتراض اور خدشات ہیں کہ ملک یا صوبوں کی آبادی اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہیے تھی جتنی کہ اب سامنے آئی ہے۔

1998 کی مردم شماری کے مطابق پاکستان کی کل آبادی 13 کروڑ 23 لاکھ 52 ہزار 279 نفوس پر مشتمل تھی جبکہ 2017 کی حالیہ آدم شماری کے عبوری نتائج کے مطابق ملک کی آبادی 20 کروڑ 77 لاکھ 74 ہزار 620 نفوس پر مشتمل ہے۔انیس برسوں کے عرصے میں یہ 2.40 فیصد کے تناسب سے آبادی میں اضافہ ہے جو اپنے آپ میں ایک خطرناک صورتحال کو بیان کرتا ہے۔ پاکستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کا پانچواں بڑا ملک بن گیا ہے۔صرف ہندوستان، چین، امریکہ اور انڈونیشیا کی آبادی ہمارے ملک سے زیادہ ہے۔ ہمارے ملک کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوشحال اور ترقی یافتہ ممالک مثلاً چین اور جاپان وغیرہ کی آبادی اگر اس رفتار سے بڑھ رہی ہو تو ان کی نیندیں اڑ جائیں۔ کیونکہ ان ممالک کے باشندوں خواہ عوام کو اچھی طرح معلوم ہے کہ آبادی میں اضافہ بہر حال وسائل پر دباؤ کی صورت میں اپنا مکروہ چہرہ سامنے لاتا ہے۔لیکن ہمارے ملک میں چونکہ اس طرح سوچنے کی روایات معدوم ہیں اور خاندانی منصوبہ بندی کو آج بھی عوام کی بھاری اکثریت جو مذہبی پیشواؤں کے زیرِ اثر ہے، غلط اور اسلامی تعلیمات کے منافی گردانتی ہے۔ اسکے علاوہ محض عددی اکثریت دکھا کر اپنا لوہا منوانے کی خُو بھی بڑے زوردار طریقے سے موجود ہے ہماری نفسیات میں۔ حالانکہ پڑوسی مسلمان ممالک مثلاً ایران اور بنگلہ دیش نے اپنے لوگوں کو یہ باور کرانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے کہ محض آبادی میں اضافہ کرتے جانا مسائل کا حل نہیں بلکہ مسائل پیدا کرنے کی کنجی ہے۔ نتیجتاً ان دونوں ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی پر بہت اچھے اور کامیاب طریقے سے عمل کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں البتہ اس معاملے کو کبھی بھی دھیان طلب نہیں سمجھا گیا۔خاندانی منصوبہ بندی پڑوسی مسلم ممالک میں غیر اسلامی فعل نہیں ہے لیکن ہمارے ہاں پولیو کے قطرے پلانے والا عملہ بھی غیر اسلامی فعل کا مرتکب مانا جاتا ہے اور اسے گولیوں سے بھون دیا جاتا ہے۔

چنانچہ مردم شماری کے عبوری نتائج کا اعلان ہوتے ہی تقریباً سب سیاسی جماعتوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی سے لیکر ایم کیو ایم تک اور جمیعت علماء اسلام سے لیکر سندھ کی قوم پرست جماعتوں تک ہر ایک نے نتائج کو کالعدم قرار دینے پر اصرار کیا۔ ہر ایک نے شکوہ کیا کہ اس کی قوم یا حلقہء انتخاب میں لوگوں کی تعداد ان کی توقع سے کہیں کم بتائی گئی ہے جو یقیناً انصاف اور شفافیت کے منافی ہے۔اس شدید ردِ عمل سے یہ بات بھی عیاں ہو رہی ہے کہ ہماری سیاسی قیادت نے مردم شماری سے کس قدر بڑی اور زوردار توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔

1998 کی مردم شماری کے مطابق سندھ کی مجموعی آبادی 3 کروڑ 4 لاکھ 39 ہزار 893 نفوس پر مشتمل تھی جو گذشتہ انیس برس کے دوران 2.31 فیصد اضافے کے ساتھ حالیہ شماریات میں 4 کروڑ 78 لاکھ 86 ہزار 51 نفوس پر مشتمل بتلائی گئی ہے۔صوبے کی آبادی میں تقریباً پونے دو کروڑ لوگوں کا اضافہ اور وہ بھی محض انیس برسوں میں، ہمارے سندھ کے زعماء اور سیاسی جماعتوں کو ایک آنکھ نہیں بھایا۔انہیں امید تھی کہ سندھ کی آبادی کم از کم سات کروڑ تو ضرور ہوگی۔ اب جو وہ امید پوری نہیں ہوئی تو سب کو خفگی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ دوسری جانب خیبر پختون خواہ کی آبادی میں اضافے پر بھی سوالیہ نشان ہے تو بلوچستان کی آبادی میں اضافے پر بھی اعتراضات ہیں۔ حالانکہ سمجھا جا رہا ہے کہ بلوچستان کی آبادی میں اضافہ زیادہ تر ان افغان پناہ گیروں کی وجہ سے ہے جو پاکستانی شناختی کارڈ بنوانے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور جنہوں نے صوبے میں بلوچوں کی آبادی کے مقابلے پشتون آبادی کو زیادہ بڑا دکھا کر بلوچوں کو خود ان کی اپنی زمین پر ایک اقلیتی نسلی گروہ کی شکل میں بدل دیا ہے۔اسی طرح کا خوف سندھیوں کو بھی لاحق ہے جو بہر حال بے بنیاد نہیں ہے۔

پاکستان کے آئین کے آرٹیکل (5) 51 کے مطابق جب بھی آدم شماری کرائی جائے گی، اس کے بعد قومی اسمبلی کی حلقہ بندیاں از سرِ نو کرنی پڑینگی تا کہ قومی اسمبلی میں صوبوں کی آبادی کی بنیاد پر نمائندگی کو یقینی بنایا جا سکے۔لیکن شماریات کے سب سے بڑے افسر جناب آصف باجوہ صاحب نے فرمایا ہے کہ اپریل 2018 سے پہلے یہ ہرگز ممکن نہیں ہوگا کہ حالیہ آدم شماری کے حتمی نتائج شایع کیے جا سکیں۔ یقیناً یہ ایک حیران کن بات ہے کہ عبوری نتائج سامنے لانے کے باوجود حتمی اور سرکاری نتائج شایع کرنے کیلئے آٹھ سے دس ماہ مزید درکار ہونگے۔ باجوہ صاحب کے اس بیان سے تو الیکشن کمیشن آف پاکستان کیلئے بھی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اگر واقعتاً مردم شماری کے حتمی نتائج اس قدر تاخیر کے ساتھ شایع ہونگے تو پھر یا تو اگلے برس ہونے والے انتخابات کو کچھ عرصے کیلئے مؤخر کرنا پڑے گا یا پھر آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نظریہء ضرورت کے تحت یہ فیصلہ لیا جائے گا کہ فی الحال انتخابات پرانی حلقہ بندیوں کے مطابق ہی کرائے جائیں اور انتخابات کے بعد نئی حلقہ بندیاں کس طرح کی جائیں، اس سوال کو دیکھا جائے گا۔ یقیناً یہ ایک تاریخی مذاق ہوگا۔ جو پاکستان اور اس کی آئینی تاریخ میں نہ پہلا اور نہ آخری ہوگا۔

سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے نجکاری و شماریات کو بریفنگ دیتے ہوئے جناب باجوہ صاحب نے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا کہ پاکستان کے سات کروڑ باشندوں کے پاس آج بھی

قومی شناختی کارڈ نہیں ہیں۔ اب آپ یہ نہ کہیے گا کہ پھر جوہری طاقت بننے کا پاکستان کو کیا فائدہ ہوا۔ کیونکہ ایک ایسا ملک جس کے پاس ساری دنیا کو تباہ و برباد کرنے کی طاقت بھی ہو لیکن اس کے بیس میں سے سات کروڑ لوگ اپنا قومی شناختی کارڈ نہ رکھتے ہوں یہ دو الگ الگ معاملات ہیں۔

باجوہ صاحب سے جب مذکورہ کمیٹی نے دریافت کیا کہ یہ کیا وجہ ہوئی کہ کراچی اور لاہور کی آبادی میں بس معمولی سا فرق باقی رہ گیا؟ اور انہی انیس برسوں میں لاہور کی آبادی میں دوگنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ جبکہ کراچی کی آبادی میں محض 59 فیصد اضافہ ہوا ہے، تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ چونکہ حکومت نے کراچی کے دو اضلاع کو شہری کی بجائے دیہی قرار دے رکھا ہے جبکہ اس کے برعکس لاہور کے تمام اضلاع کی حیثیت شہری آبادی کی ہے لہٰذا کراچی اور لاہور کی شہری آبادی میں یہ فرق اسی وجہ سے ہے۔

حالیہ مردم شماری کے دوران ملک بھر میں 168943 بلاک بنائے گئے تھے جن کے کم از کم ایک فیصد کو دوبارہ شمار کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور شماریات کا محکمہ بھی اس پر معترض نہیں ہے۔ لیکن اس مرتبہ فوج کی ڈیوٹی محض شماریاتی عملے کو تحفظ فراہم کرنے کی نہیں تھی بلکہ وہ اپنے طور پر آدم شماری کا عمل بھی سرانجام دے رہے تھے۔ قاری شاید یہ سوچے گا کہ ایسا پاک فوج کی مالی اعانت کی خاطر کیا گیا تھا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ فوج کے ذریعے شماریاتی عمل سرانجام دلانے کے پیچھے یہی سوچ کارفرما تھی کہ چونکہ یہی ایک ادارہ ہے اس ملک میں جو ہر طرح کے فرائض انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے یا بالفاظِ دیگر گذشتہ ستر برس میں اگر کسی ادارے کی نشو نما ہوئی ہے تو وہ یہی ادارہ ہے لہٰذا اسی ادارے سے مدد لینی چاہیے۔ پھر اس کا ایک اور فائدہ بھی تھا، اور وہ یہ کہ بقول شاعر:

سواروں پر سواری فوج کی ہے،
زمیں ساری کی ساری فوج کی ہے۔

کے مصداق جب مردم شماری فوج کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائی ہو گی تو کسی کو جرئت نہیں ہو سکے گی کہ اس کے بعد بھی وہ اس مسئلے پر سیاست کرے اور اس عمل کو متنازعہ بنا سکے۔

اس ملک کی 60 فیصد آبادی ان نوجوانوں پر مشتمل ہے جن کی عمریں 30 سال یا اس سے کم ہیں۔ لیکن ان کیلئے روزگار کے مواقع انتہائی محدود ہیں۔ انسانی ترقی کے حوالے سے دنیا کے ممالک کی فہرست میں پاکستان کا نمبر 147 ہے۔ ملک میں تعلیمی تناسب تمام تر مبالغہ آرائیوں کے باوجود 58 فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ ملک کی 30 فیصد آبادی خطِ غربت سے نیچے زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ پاکستان کے جیسا ملک جس کی تیس فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گذارنے پر مجبور ہو اور جس کی چالیس فیصد سے زیادہ آبادی ان پڑھ افراد پر مشتمل ہو، آسانی کے ساتھ انتہا پسندی کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ جب آپ کے ملک کی نوجوان نسل کیلئے تعلیم اور روزگار مفقود ہونگے تو پھر آپ انہیں انتہا پسندی سے متاثر ہونے سے نہیں روک سکتے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ملک کی سیاسی قیادت کو اس بات کی کوئی فکر نہیں، انہیں تو بس اپنی فکر لاحق ہے، ان کے درمیان تو اقتدار کے حصول کی خاطر چھینا جھپٹی اور کھینچا تانی جاری ہے۔

1947 میں پاکستان کی آبادی 27 ملین یعنی دو کروڑ ستر لاکھ تک تھی۔ اب اس ملک کی آبادی بیس کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ اس ملک کی آبادی کو ڈبل ہونے کیلئے محض پچیس سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم نے امت میں اضافے کا عمل اسی طرح جاری رکھا تو آئندہ پچیس برس بعد اس ملک کی آبادی ہو گی چالیس کروڑ سے کچھ زیادہ۔ اور اگر یہی سلسلہ آئندہ ایک صدی تک مزید جاری رہے تو پاکستان کی آبادی پہنچ جائے گی 7 ارب 20 کروڑ انسانوں تک جو آج کے زمانے میں پوری دنیا کی مجموعی آبادی ہے۔ اگر آج سے ڈیڑھ صدی بعد کے متعلق سوچیں تو پاکستان کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ ملک کی تمام آٹھ لاکھ مربع کلو میٹر زمین پر انسان ہی انسان کھڑے ہونگے کندھے سے کندھا ملائے۔ فقط اس وقت یہ ناممکن ہو گا کہ وہ مزید بچے پیدا کر سکیں۔ ایسی صورت میں ہمارے وہ فوجی جنرل جو رٹائر ہونے کے بعد 93 ایکڑ زمین تحفتاً وصول کرتے ہیں تب زیادہ خوش قسمت سمجھے جائینگے اگر انہیں 93 مربع فٹ زمین مل جائے گی تو۔

الغرض پاکستان کی حالیہ آدم شماری کے نتائج اس حوالے سے زیادہ خطرناک نہیں ہیں کہ کسی قوم یا شہر کی آبادی کو کم دکھایا گیا ہے بلکہ اس حوالے سے خطرناک ہیں کہ ہمارے ملک کی آبادی بڑے بے ہنگم طریقے سے بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمیں مقدار پر نہیں معیار پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف ہمارا یہ حال ہے کہ اگر فوج نہ ہو تو ہم آگ نہیں بجھا سکتے دوسری طرف ہم یہ کہتے ہیں کہ آدم شماری غلط ہوئی ہے۔ فرض کریں اگر یہ بات درست تسلیم کر لی جائے کہ آدم شماری غلط ہوئی ہے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کو کس نے بتایا کہ آدم شماری غلط ہوئی ہے؟ یعنی آپ کے پاس کیا ذرائع ہیں جن کی بنا پر آپ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آدم شماری ٹھیک نہیں ہوئی؟ دوسرا یہ کہ ہمارے پاس ایسا کون سا نظام موجود ہے جس کی بنا پر ہم اس معاملے کو چیک کر پائینگے کہ آدم شماری درست طور پر ہوئی کہ نہیں؟ کیا ہم اس دوبارہ چیک کرنے کا ٹھیکہ پھر سے فوج کے حوالے کرنے پر مجبور نہیں ہونگے؟ اور اگر ایسا ہی ہونا ہے تو پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ اسی فوج نے جو آدم شماری کی ہے اس کے نتائج کو تسلیم کر لیں۔

اب جہاں تک حکمران سیاسی جماعتوں کا تعلق ہے تو ان کی تو این۔ ایف۔ سی ایوارڈ میں زیادہ حصہ داری اور قومی اسمبلی میں بڑھنے والی نشستوں پر نظر ہے۔ لیکن عوام اور عوام دوست سیاست کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ فی الوقت این۔ ایف۔ سی ایوارڈ کے ذریعے ملنے والا حصہ عام لوگوں کی بہتری کی خاطر کس قدر خرچ ہو رہا ہے۔ اسی طرح فی الوقت قومی اسمبلی کی جتنی نشستیں ہیں ان میں سے کتنی نشستوں پر عوام یا عوامی نمائندے منتخب ہوئے بیٹھے ہیں۔

لہٰذا بائیں بازو کی قوتوں اور عوام دوست سیاست کرنے والی جماعتوں کو حکمران سیاسی جماعتوں کے برعکس اس بات پر اصرار کرنا چاہیے کہ خاندانی منصوبہ بندی پر سختی کے ساتھ عمل کیا جانا چاہیے اور حالیہ آدم شماری میں اگر کہیں کوئی کمی بیشی رہ گئی ہے تو کسی ایک فارمولے کے تحت مثلاً ایک فیصدی شماریاتی بلاکس کی دوبارہ گنتی کر کے خدشات ختم کیے جائیں نیز عوام کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے، ملک کے انفراسٹرکچر کو بہتر کرنے، فوج کے علاوہ دیگر اداروں کو بھی پنپنے اور مستحکم ہونے کا موقع دیا جانا چاہیے اور ملک کے بنیادی گمبھیر مسائل کے حل کی طرف توجہ مبذول کی جائے نہ کہ عددی اکثریت کے بل پر شیخی بگھارنے کی کوشش کی جائے۔

☆☆☆

عوامی ورکرز پارٹی کے سابق صدر اور بائیں بازو کے عظیم رہنما

جناب عابد حسن منٹو کا خصوصی انٹرویو

(یہ انٹرویو جناب فرحان احمد خان نے لیا تھا اور ہم روزنامہ ۹۲ نیوز کے شکریئے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں)

آٹھ دہائیوں پر مشتمل بھرپور تحریکی زندگی گزارنے والے اس شخص سے مل کر لگتا ہے کہ بڑھاپے نے انکا کچھ نہیں بگاڑا وہ استوار لہجے میں دلیل کے ساتھ بات کرتے ہیں، مکالمے کے دوران وقفے وقفے سے انکے چہرے پر پھیلتی شگفتہ مسکراہٹ ماحول میں تازگی کا احساس دلاتی ہے، یہ عابد حسن منٹو ہیں، پاکستان کے ممتاز وکیل اور بائیں بازو کے نمایاں سیاستدان ۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ کے سبھی نشیب وفراز انہوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھ رکھے ہیں۔گنگا ہائی جیکینگ اور حیدرآباد سازش کیس جیسے تاریخی نوعیت کے حامل کئی مقدمات میں بطور وکیل پیش ہوتے رہے ہیں۔سیاسی جدوجہد کے دوران پس زنداں بھی دھکیلے گئے ۔عابد حسن منٹو کے تجربات اور مشاہدات جاننے کے لئے چند دن قبل ماڈل ٹاؤن لاہور میں واقع انکی رہائش گاہ میں انکے ساتھ تفصیلی نشست ہوئی، بات انکی سیاسی فکر سے شروع ہوئی اور کئی موضوعات تک پھیلتی چلی گئی۔

میں نے پوچھا کہ پون صدی قائم رہنے والا سوشلسٹ بلاک ٹوٹ گیا تو کیا یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ سوشلزم اپنی موت آپ مر چکا، انہوں نے قدرے اطمنان کے ساتھ سوال سنا اور اپنی بات کچھ یوں شروع کی۔

مارکس ازم 1917ء پر فکس نہیں

سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے سے سوشلسٹ کیمپ ختم ہوگیا تھا، سوشلسٹ کیمپ کی شکست و ریخت کے بعد بائیں بازو کے کچھ سربرآوردہ لوگوں نے کہا کہ یہ زوال کچھ وجوہات کی بنیاد پر ہے یہ سوشلزم کی شکست نہیں ہے پھر ٹھیک دس سال بعد بلکہ نوے کی دہائی کے آخری برسوں میں ہی لاطینی امریکہ میں ہیوگو شاویز وغیرہ کی قیادت میں سوشلزم کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی کیوبا میں فیڈرل کاسترو بھی اس نئی لہر کی مثال تھے۔معاشی ناکہ بندیوں اور محدود وسائل کے باوجود وہ قائم رہے پھر نئی صورتحال کو دیکھ کر دنیا بھر کے سوشلسٹوں کے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ یہ نیا سوشلزم کیا ہے اس نوع کے کئی سوال پیدا ہوگئے کئی ملک اس نئی لہر کے زیر اثر تھے اس کے بعد جب سرمایہ داری دنیا میں بحران آئے تو خود سرمایہ داریت کے حامی ماہرین نے کہا کہ یہ ماضی سے مختلف بحران ہے، یہ عالمی معاشی بحران کا حصہ ہے اور اسکو دستیاب نظام میں ٹھیک کرنا مشکل ہے اس صورتحال میں اس دھرتی پر ''برنی سینڈر'' جیسے سوشلزم کا نام لینے والے لوگ پیدا ہوگئے، ۱۹۱۷ میں جس قسم کا سوشلزم لایا گیا تھا اب سو برس بعد اسکی ہیئت اسی کی طرح نہیں ہوگی تقاضے بدل چکے ہیں، مارکسزم کی بنیاد اس بات پر ہے کہ دنیا بدلتی ہے اسکے سیاسی و معاشی رجحانات بدلتے ہیں اس کے مطابق سوسائٹی آگے کی طرف جاتی ہے مارکسزم کوئی جامد عقیدہ نہیں ہے اس کی اساس یہ ہے کہ ہم نے طبقاتی معاشرے کو ختم کرنا ہے، کیسے کرنا ہے اس کے راستے ہر جدید زمانے اور معاشرے میں مختلف ہونگے ۔آج کی دنیا کے مختلف خطوں میں مارکسزم کی بنیاد پر اصلاحات کے طریقے وہاں کے حالات اور نظام کار کو دیکھتے ہوئے کئے جاسکتے ہیں، اس لئے یہ سمجھنا کہ سوشلزم ۱۹۱۷ کے واقعے پر فکس ہوئی ہے درست نہیں۔

سوشلسٹ بلاک ٹوٹنے سے میرے خواب بھی بکھرے

خواب کس کے بکھرے جو لوگ سوویت یونین کے ساتھ جذباتی طور پر وابستہ تھے، انہی کے خواب زیادہ بکھرے لیکن یہ قدرتی عمل ہے کہ میرا خواب بھی بکھرا، اس لئے کہ سوشیو پولیٹیکل پلیٹ فارم پر کھڑی اتنی بڑی سلطنت کچھ داخلی تضادات حل نہ کرسکنے کی وجہ سے فیل ہوگئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ناکامی کی وجوہات کی جانچ ہونی چاہئے۔ایک ایسی ریاست جس نے سب لوگوں کو، روزگار، تعلیم، اور صحت کی سہولیات دیں تو پھر وہ ۷۰ سال بعد ناکام کیوں ہوگئی مارکسزم ہمہ وقت سوال اٹھاتا رہتا ہے کہ موجودہ وقت میں کن تقاضوں کو ایڈریس کرنا چاہئے۔

جو بھی استعماری قوتوں کا مخالف ہے وہ لیفٹسٹ ہے

دنیا میں قائم استعماری (جیسا کہ ابھی تک موجود امریکن بلاک)، اور ان تمام قوتیں جن کی یہ کوشش ہے کہ تیسری دنیا تیسری ہی رہے اور وہ اسکا خون نچوڑتے رہیں، بین الاقوامی تناظر میں ان سب قوتوں کی مخالفت کرنے والا بائیں بازو کا سمجھا جائے گا۔۔دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ مخالفت تو آپ کر رہے ہیں، لیکن آپ چاہتے کیا ہیں آپ کا ورلڈ ویو کیا ہے اگر آپ سوشلزم کرنے کے لئے ۱۹۱۷ سے لیکر آج تک کے کامیاب و ناکام تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک نئے انداز میں کام کرتے ہیں تو آپ آج کے لیفٹسٹ ہیں۔ہم نے دیکھا کہ ماضی میں مزدور طبقے کی آمریت قائم کر دی گئی کیا کارل مارکس سمجھتے تھے کہ ہمیشہ مزدوروں کی آمریت قائم رہے گی تجربات سے ثابت ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔

چین سوشلزم سے منحرف نہیں ہوا پالیسی شفٹ ہے

گفتگو کا رخ چین کی بدلتی پالیسیوں کی طرف مڑا تو کہا، ابھی چائنیز کمیونسٹ پارٹی

کی آخری کانگریس میں کہا گیا کہ ہم نے اتنا بڑا انقلاب کیا جو ۱۹۳۰ سے شروع ہو کر ۱۹۴۹ تک پہنچ کر منتج ہوا اس وقت ہم سمجھے کہ ہمارے ملک پر اب ہمارا قبضہ ہو چکا ہے اب ہم نے یہاں سوشلزم نافذ کر دینا ہے لیکن اب ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سوشلزم یوں نہیں ہوتا، سوشلزم کی پہلی شرط یہ ہے کہ آپ لوگوں کو کھانے پینے سمیت بنیادی ضروریات زندگی دیں گے اور کھانے پینے کی چیزیں تو آپ کے پاس ہیں ہی نہیں آبادی ایک بلین سے اوپر ہے اور اکثریت دیہات میں رہتی ہے اس صورتحال میں ہمیں کیا کرنا چاہئے، اب انہوں نے اپنی پالیسی ترتیب دی ہے ان پر تنقید ہوئی کہ آپ اپنے راستے (سوشلزم) سے ہٹ گئے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہم پیچھے نہیں ہٹے، بلکہ ہم نے لوگوں کو جو دینا ہے اسکو پیدا کرنیکی منصوبہ بندی کر رہے ہیں اور منزل آج بھی سوشلزم ہے۔

سوشلزم کا نعرہ ہمارے سماج میں اجنبی نہیں سوال یہ تھا کہ سوشلزم کا نعرہ ایک سماج میں کیسے پنپ سکتا ہے جہاں اکثریت مذہب کو مانتی ہو۔

عابد حسن منٹو نے کہا، ہم نے اپنے ملک میں اجنبی آوازیں انگریزوں کے دور سے سننا شروع کیں جس قسم کی جمہوریت یہاں موجود ہے، اسلام میں تو اسکا کوئی ذکر نہیں ہے، وہاں تو شورائی حکومتیں تھیں، اس قسم کی جمہوری پارٹیاں نہیں تھیں، اس قسم کے الیکشن نہیں تھے یہ سب ہم نے قبول کیا اب سوائے دائیں بازو کے انتہائی رجعت پسند لوگوں کے کوئی ایسا نہیں جو یہ کہتا ہو کہ جمہوریت نہیں ہونی چاہئے، جمہوریت تو سترھویں اٹھارویں صدی کی پیداوار ہے اور سرمایہ دارانہ نظام میں داخلی سطح پر آنے والی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے یہ سرمایہ داروں کے اپنے مفاد میں ہے یہ ہمارے آئین کا حصہ بھی بنی آئین اسلام کی بات کرتا ہے لیکن جمہوریت اس کی بنیادی شق ہے۔

طبقاتی نظام سے پاک جمہوریت کا سوشلزم سے تضاد نہیں؟

جب آپ سماج کو ایک راستے پر چلانے کے قابل ہو جاتے ہیں اور تبدیلی کے ابتدائی درجے طے کر لیتے ہیں تو پھر آپ کو لوگوں کو انوالو کرنا پڑیگا اپنی پارٹیوں اور سماج کے اندر جمہوری عمل جاری کرنا پڑے گا کمیونسٹوں کی جانب سے ماڈرن ڈیموکریسی کی مخالفت صرف اس حدتک ہے کہ ماڈرن جمہوریت سرمایہ دارانہ نظام کے تحت کام کرتی ہے جس کا فائدہ سرمایہ دارانہ طبقات اٹھاتے ہیں اگر طبقات کو ختم کر دیا جائے تو پھر جمہور کو انوالو کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔

آمریت کے مقابلے میں ہم سرمایہ دارانہ جمہوریت کا ساتھ دیتے ہیں

جب تک سرمایہ داری نظام ملک میں موجود ہے تو یہ حقیقت ہے کہ اس کے ٹولز سرمایہ داروں کے پاس ہیں لیکن سمجھنا چاہئے کہ جمہوری حقوق صرف الیکشن نہیں ہوتے ہمیں آئین نے ''رائیٹ ٹو آرگنائز'' دیا ہے اور اپنے نظریات کے پرچار کی آزادی دی ہے یہ جمہوریت کا حصہ ہے، جمہوریت کے بہت سارے ایسے پہلو ہیں جنہیں بایاں بازو اور نچلے طبقات اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود جب تک جمہوریت سرمایہ دارانہ نظام کے تحت چلتی ہے تو اس کے بنیادی مفادات سے صرف سرمایہ دار ہی مستفید ہوتے ہیں وہی حاکم رہتے ہیں اس لئے ہم اسے سرمایہ دارانہ جمہوریت کہتے ہیں لیکن جب اس سرمایہ دارانہ جمہوریت کو توڑ کر مارشل لاء لگتا ہے تو ہم سب اسکی مخالفت کرتے ہیں کوئی بائیں بازو کا آدمی پاکستان میں مارشل لاء کو درست کہنے والا نہیں ملے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہمارا ملک اتنا پسماندہ ہے کہ یہاں ابھی تک ایلیمنٹری ماڈرن انسٹیٹیوشن (اسمبلی اور بالا دست عدالتیں) صحیح طرح سے قائم نہیں ہو سکی ہیں ان اداروں کو کوئی چھیننے کی کوشش کرے گا تو اس کے خلاف ہم کھڑے ہونگے ہم یہ چاہتے ہیں کہ تیسری دنیا کو، تیسری دنیا سے آگے لیجانے کے اسباب پیدا کئے جائیں۔ میں نے پوچھا : گویا آپ چھوٹی مصیبت (سرمایہ دار جمہوریت) اختیار کرتے ہیں تو کہا اختیار نہیں کرتے بلکہ چھوٹی مصیبت کا اس وقت تک دفاع کرتے ہیں جب تک وہ بڑی مصیبت کے ساتھ لڑ رہی ہو۔

''پاکستان میں حکومتیں جاگیرداروں کی مدد سے بنتی ہیں اس لئے زرعی اصلاحات نہیں ہوتیں''

جاگیرداری نظام کے خاتمے میں سب سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ ہم اسے کسی انقلاب کے زریعے تو نہیں توڑ رہے بلکہ آئینی اور قانونی راہ سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اسمبلیاں اور قانون انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہیں، آخری عام انتخابات (۲۰۱۳) کا جائزہ لے لیں اور دیکھیں کہ اکثر منتخب ہونے والے افراد کا تعلق فیوڈل کلاس سے ہے، حتی کہ ہمارے ملک میں نئے بورژوائی (ہمارے ہمسائے نواز شریف وغیرہ) بھی منتخب ہوئے تو یہ بھی جاگیرداری کے بغیر اپنی حکومت نہیں بنا سکے یہی وجہ ہے کہ اس سسٹم کے اندر رہتے ہوئے جاگیرداروں کے خلاف موثر کام نہیں ہو سکتا، ماضی میں جو ایک دو بار زرعی اصلاحات کی گئیں وہ صحیح طور پر نافذ نہیں کرنے دی گئیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری فوج (جسکے بہت سے کاموں کی ہم تعریف بھی کرتے ہیں) خود زمینوں کی مالک ہے اب ظاہر ہے اگر آپ زمینوں کے مالک ہونگے، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائیٹیز چلائیں گے تو پھر آپ انکا دفاع ہی کریں گے یہ سارا سیٹ اپ زرعی اصلاحات کے خلاف کھڑا ہے۔

''مرکزی دھارے میں نظریاتی ہم آہنگ پارٹی نہ ہونے کی وجہ سے ٹریڈ یونین منتشر ہیں''

پاکستان میں ٹریڈ یونین کی کمزوری کی وجہ یہ ہے کہ ٹریڈ یونین پولیٹیکل ویکیوم میں کام نہیں کر سکتی، پاکستان میں کسی ایسی نمایاں سیاسی پارٹی کی عدم موجودگی میں جو مزدور طبقے کے ساتھ تعلق رکھتی ہو، ٹریڈ یونین پروفیشنل ازم بن جاتی ہے انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا اور یہ سب ایسی سوسائٹی میں ہوتا ہے جہاں ساری کی ساری سیاسی قوتیں انکے خلاف کھڑی ہوتی ہیں پھر وہ ان قوتوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں اسی سے ٹریڈ یونین ازم تباہ ہو جاتی ہے، دھڑے بن جاتے ہیں اور یہ مراعات حاصل کرنے کے ہتھکنڈوں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

پاکستان کی تشکیل پر ایمان بننے کا سبب کمیونسٹ پارٹی کا فیصلہ بھی تھا

۱۹۴۶ء کے آخر میں مسلم لیگ کافی متحرک تھی، میں اس وقت راولپنڈی میں تھا مجھے بتایا گیا کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے تقسیم کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا ہے یہ میرے لئے بڑی ری انفورسمنٹ کا باعث تھا میرا پاکستان کی تشکیل پر ایمان بننے کا سبب کمیونسٹ پارٹی کا یہ فیصلہ بھی تھا، پھر جب پاکستان بن گیا تو اس ملک کی مخالفت کرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا، اس

میں کیا نظام نافذ کرنا ہے اس پر بحث البتہ ہوسکتی ہے، میں تقسیم کے دنوں ،قریب ۱۵ برس کا تھا، پاکستان بنانے کے حق میں جلوس نکل رہے تھے، میں بھی ایک جلوس میں والد کے ہمراہ تھا جب قیادت گرفتار ہوئی تو ساتھ ہی ہم بھی پکڑے گئے، چھ سات دن بعد مجھے چھوڑ دیا گیا یہ میری پہلی اسارت تھی، میں اس سارے عمل میں شامل رہا لیکن بہت سارے بائیں بازو والے ذہنی طور تقسیم کو قبول ہی نہیں کر سکے تھے کیونکہ وہ تحریک کا حصہ تھے ہی نہیں، وہ کانگریس کے قریب تھے باوجودیکہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا فیصلہ تھا کہ پاکستان کی حمائت کی جانی ہے۔

سکھ نوجوان گلی سے نکلا تو مشتعل ہجوم نے اسے قتل کر دیا

تقسیم کے زمانے میں راولپنڈی پنجاب کے اس حصے سے تعلق رکھتا تھا جہاں نہ تو کوئی بڑی ذمینداری تھی ، نہ کوئی انڈسٹری تھی ، اور نمایاں طور یہ فوجی علاقہ تھا ،فوج کی بھرتی ، ٹرینگ وغیرہ سب یہیں ہوتی تھی، تقسیم سے پہلے جب یہاں مسلم لیگ بنی تو اس وقت مسلم لیگ کے اندر یہ جھگڑا پڑا کہ ہمیں ایک نیشنل گارڈ بنانی چاہیئے ، یہ ۴۵/۴۶ء کی بات ہے میرے والد کا کہنا تھا کہ یہ سیاسی پارٹی ہے اس میں گارڈ کا کیا کام ،لیکن دوسرے لوگوں کی رائے الگ تھی ، انہیں مسلمانوں کی احیاء کے مختلف ادوار سے متعلق اسلامی جرنیل یاد آتے تھے، مختصر یہ کہ نیشنل گارڈ بن گئی ، وہ روز پریڈ کرتی تھی ، ان دنوں راولپنڈی ضلع کے کسی کونے (شائد کہوٹہ) میں ایک مسلمان قتل ہو گیا اس کے ردعمل میں راولپنڈی کی نیشنل گارڈ نے ایک جلوس نکالا جس میں ننگی تلواروں کے ساتھ وہ شریک تھے پھر ایک سلسلے وار ردعمل شروع ہوا۔اس زمانے میں ہمارے دادا کا گھر اس محلے میں ایسی جگہ پر واقع تھا جس کے آگے میدان تھا ، وہاں چند قبریں تھیں (جو جعلی تھیں) انگریزوں کے زمانے میں وہ وہاں ایک مشنری ادارہ چرچ بنانا چاہتے تھے ، مسلمانوں نے راتوں رات وہاں قبریں بنا دی تھیں) وہ اب بھی ہیں ، اس میدان ایک سرے پر ہم مقیم تھے سامنے والی گلی میں ہندو رہتے تھے جو اتفاق سے سب کے سب کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک سکھ نوجوان ہمارے گھر کی پچھلی گلی سے نکل کر اس میدان میں سے جا رہا تھا وہ ڈرا ہوا لگتا تھا جونہی وہ بیچ میں پہنچا تو پچھلی گلیوں سے تلواریں سونتے ہوئے لوگ نعرے لگاتے ہوئے نکلے وہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے اس کہوٹہ والے قتل کا بدلہ لینا ہے ، یہ منظر میں نے خود اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر دیکھا ہے پھر اس سکھ شخص کو میری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا گیا۔

1948ء میں میرے والد دلبر داشتہ ہو کر مسلم لیگ سے الگ ہو گئے تھے

قائداعظم کی ۱۱ اگست ۴۸ء کی تقریر بہت زکر ہو چکی اس کا مطلب یہ تھا کہ اب پاکستان بن گیا اب ہمیں یہاں دوسرے لوگوں (اقلیتوں) کے بارے میں بھی سوچنا ہے ، انکے حقوق کا بھی خیال رکھنا ہے میں ۱۹۳۲ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوا ، ۱۹۴۲ء تک ہمارا خاندان کانگریس میں تھا ، اس کے کچھ عرصے بعد ہمارے والد مسلم لیگ میں چلے گئے اور اسکے لیڈر رہنے لیکن آپ غور کریں کہ ۴۲ء میں پارٹی کی بنیادیں کھڑی کرنے اور ۴۷ء میں ملک بنانے کے بعد کیوں ۱۹۴۸ء میں میرے والد مسلم لیگ سے دلبر داشتہ ہو کر الگ ہو گئے تھے۔دراصل مسلم لیگ انکے زہن میں موجود تصور (جو قائداعظم کے تصور سے ہم آہنگ تھا) کے مطابق نہیں چل رہی تھی

رویئے میں اعتدال دادا کی خاموش تربیت کا نتیجہ ہے

میری پرورش میں ایک بڑا اثر ہمارے دادا کا پڑا ہے وہ وکیل تھے اور، ۱۹۰۴/۵ء سے وکالت کر رہے تھے ہمارے کنبے میں ۴۶ء تک جوائنٹ فیملی سسٹم قائم رہا جب تک کہ انہوں نے وہ گھر بیچا نہیں ہمارے دادا پھندے والی ترکی (روسی) ٹوپی ، بند گلے کا کوٹ اور بڑی چمکدار برکابی زیب تن کرتے تھے ، پانچ وقت کے نمازی تھے لیکن انہوں نے اپنے خاندان میں کسی کو نظریات کے حوالے سے مجبور نہیں کیا ، انکے سب سے چھوٹے بیٹے کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے اور آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے لیڈر تھے ، دوسرے محمود منٹو ساحب علامہ عنایت اللہ مشرقی کے خاکساروں میں شامل ہو گئے تھے میرے والد پہلے کانگریس اور پھر مسلم لیگ میں آ گئے تھے ، یہ ہمارے گھر کا تنوع تھا ہم نے اس وقت یہ سیکھا تھا۔

”جب میں میلادالنبی کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ایک لفظ پر رک گیا تھا“

میرے نظریات ۱۹۴۹/۵۰ء سے بننے شروع ہوئے ساٹھ برس گزر جانے کے بعد وہ مجھ میں اتنے رچ بس چکے ہیں کہ اب انہی کے ساتھ جیتا ہوں لیکن میری اپنی پرورش زرا الگ ماحول میں ہوئی ، ۱۹۴۲ء میں ، میں اسلامیہ ہائی اسکول مری روڈ ، راولپنڈی میں داخل ہوا ، اس سارے دورانیئے میں ہم آریہ محلے میں رہتے تھے ، پاکستان بننے تک ہمارا گھر اسی محلے میں تھا اس محلے میں مکینوں کی غالب اکثریت ہندو تھی ، ہماری گلی میں البتہ ہندوؤں کا کوئی گھر نہیں تھا ، گلی کی دوسری طرف دو مسیحی اور ایک یہودی گھرانہ آباد تھا اسی گلی میں ایک گھر احمدیوں کا بھی تھا ، ہمارے گھر میں ہر سال عید میلاد کی تقریب ہوتی تھی (میں نے پوچھا کہ آپ تو اسکول میں نمازیں پڑھاتے رہے ہیں ؟ مسکراتے ہوئے کہا ، نماز تو اتنی نہیں پڑھائی جتنی کہ اذانیں دیتا رہا) میلاد کی محفل میں ایک تقریر کرنی ہوتی تھی جو ہمارے چچا کسی بچے کو تیار کر کے دیتے تھے ، مجھے بھی وہاں ایک تقریر کرنے کا موقع ملا ، اس گلی کا جو ماحول اور کلچرل میک اپ بن چکا تھا اسکا مجھ پر عجیب اثر ہوا ، میرے چچا کی طرف سے لکھی گئی تقریر میں ایک واقعہ بھی شامل تھا جس میں اس یہودی کا زکر تھا جس نے مسجد نبوی میں کوڑا پھینک دیا تھا ، اب اس واقعے کو بیان کرنے کے لئے تقریر کی عبارت کچھ اس طرح تھی کہ ”ایک بدذات یہودی نے گندگی پھینکی“ مجھے وہ تقریر ازبر تھی جونہی میں اس فقرے پر پہنچا تو رک گیا کیونکہ وہاں پر ہمارے دوست یہودی لڑکے اور لڑکیاں بیٹھے ہوئے تھے بعد میں مجھے تقریر ٹھیک سے نہ کرنے پر بڑی ڈانٹ پڑی ، میں نے کہا کہ آپ نے بدذات یہودی لکھا تھا ، وہاں تو فلاں بھی بیٹھا تھا یہ میرے لئے بہت عجیب تھا کہ میں انہیں بدذات کیسے کہہ سکتا ہوں جس کلچرل ماحول میں آپ پروان چڑھتے ہیں اسکا آپ کی شخصیت پر گہرا اثر ہوتا ہے

قائداعظم کی ،۱۱ ،اگست کی تقریر کی حمایت اور قرارداد مقاصد کی کی مخالفت کی تھی

میرا کمیونسٹ نظریات کے ساتھ ۴۶/۴۷ء سے ہی رشتہ جڑ چکا تھا ، اس زمانے میں ہمارے کمیونسٹ گروپ میں ایک سٹڈی سرکل ہوا ، اس میں یہ بھی تھا کہ پاکستان بنانے کی قرارداد کیا ہے ، وہ بحث میں نے کافی دلچسپی سے سنی ، وہاں ۱۹۴۰ء والی قرارداد بار بار پڑھی گئی ، شرکاء نے کہا اس میں زکر ہے کہ مسلم اکثریتی ریاستوں کو وفاقی ڈھانچے کے اندر بااختیار بنایا جائے گا

اس میں تو یہ بھی نہیں کہا گیا کہ پاکستان کے نام سے کوئی ملک بننے جا رہا ہے اور یہ بھی کہیں نہیں کہا گیا کہ اس میں نظام کیا ہوگا، اس وقت پہلی بار وہاں پر قائداعظم کی ۱۱ اگست والی تقریر بھی پڑھی گئی، یہ ساری چیزیں مجھے ری انفورس کرتی تھیں کہ کوئی یہ ایسا نظام جو جمہوری بنیادوں کی بجائے کسی عقیدے کی بنیاد پر ہے، وہ ان قراردادوں کا حصہ نہیں تھا، جب قرارداد مقاصد پاس کی گئی تو ہم نے کافی سیمینار کئے جس میں ہم نے اس سوال پر بحث کی کہ پاکستان کے نظام کی بنیاد قائداعظم کی ۱۱ اگست کی تقریر ہونی چاہیئے یا پھر قرارداد مقاصد؟ یہ اس وقت کا ردعمل تھا ہماری پارٹی نے اس وقت قرارداد پاس کی کہ قرارداد مقاصد کی بجائے قائداعظم کی تقریر کو آئین کی بنیاد بنایا جائے۔

مولانا بھاشانی کا خیال تھا کہ یہاں سیاست سیکولر بنیادوں پر ہی ہوسکتی ہے

مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) سے تعلق رکھنے والے لیڈر مولانا بھاشانی کا ذکر آیا تو کہا: میں مولانا بھاشانی کی پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کا رکن رہا ان سے بہت زیادہ تعلق تو نہیں تھا کیونکہ وہ ڈھاکہ میں رہتے تھے، کسی حد تک ان سے تعلق اس وقت بنا جب ہم نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کسان کانفرنس کرائی اس وقت وہ یہاں آئے تھے، اس کے بعد ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ پاکستان کو خدا حافظ کہنے آخری بار آئے تھے، ان دونوں موقعوں پر میں انکے ساتھ ساتھ رہا وہ بنیادی طور پر عوامی لیڈر تھے، آسام سے انکی سیاست کا آغاز بھی کسانوں کی تحریک سے ہوا، شروع میں وہ کسانوں کی تحریک کو اسلامی طریقے چلانے سے کی کوشش کرتے رہے البتہ تجربے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سیاست تو سیکولر ہی ہوسکتی ہے کیونکہ آسام اور بنگال صوبے میں ہندوؤں کی بھی بڑی تعداد تھی مولانا بھاشانی کے جلسوں پر ڈھاکہ اور لاہور میں حملے بھی ہوتے رہے، ڈھاکہ میں مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے حملہ کیا جب وہ پارٹی بنانے کے بعد پلٹن میدان میں عوامی اجتماع کے ساتھ موجود تھے، اس وقت مولانا نے سڑک پر کچھ اس طرح سے جلسہ کیا کہ بار بار وہ لوگ نماز کی نیت باندھ لیتے تھے اور پھر جلسہ شروع ہوجاتا تھا، یہ پولیس کو آگے پیچھے کرنے کا حربہ تھا، مولانا جب یہاں آئے تو اس وقت ابھی نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی) نہیں بنی تھی اس دورے میں مولانا بھاشانی کیساتھ غفار خان، ولی خان، بزنجو، خیربخش مری، عطاءاللہ مینگل، اور راؤ سکندر خان خلیل تھے، لاہور کا یہ جلسہ بھی اکھیڑا گیا، بلوائیوں میں اسلامی جمعیت طلبہ والے تو تھے ہی لیکن اس میں حکومت بھی شامل تھی، میں اس سارے منظر کا عینی شاہد ہوں۔

اسلامی جمعیت طلبہ والے پتھروں لدی گاڑیں لیکر کانفرنس ہال پر حملہ آور ہوئے

یہ پچاس کی دہائی کے کسی سال کا واقعہ ہے، اتنا یاد ہے کہ تاریخ ۲۵ دسمبر تھی، کراچی میں ہم نے طالبعموں کی ایک کانفرنس رکھی، کمیونسٹ پارٹی ۱۹۵۴ء میں کالعدم ہوچکی تھی ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اب ایک بڑی اسٹوڈنٹ پارٹی بنانی چاہیے،، کاٹرک ہال کراچی میں ہم نے اس کانفرنس کا اہتمام کیا تھا اس ہال کی اوپر والی گیلری میں بیٹھی خواتین سمیت کم وبیش پانچ چھ سو لوگ وہاں موجود تھے، ہم نے اس جلسے میں اس وقت کے وزیر قانون اے۔ کے۔ بروہی کو بلایا ہوا تھا بروہی صاحب مقررہ وقت پر نہیں پہنچے، پتہ چلا کہ وہ حیدرآباد کسی کام سے گئے ہوئے ہیں اور اب وہ چل پڑے ہیں ابھی راستے میں ہیں، ہمیں بعد میں بتایا گیا کہ انہیں ایڈوائس کی گئی تھی کہ کمیونسٹوں کے جلسے میں آپ نہ ہی جائیں تو بہتر ہے، انہوں نے انکار تو نہیں کیا، مگر کافی ڈیلے ضرور کیا، اس انتظار کے دوران ہال میں شور مچ گیا، کاٹرک ہال کو شیشے لگے ہوئے تھے اور سب دیواریں لکڑی کی تھیں شور مچا تو مرکزی دروازہ کسی نے کھول دیا اور وہاں سے اسلامی جمعیت طلبہ کے لوگ اندر آگئے نہ صرف وہ بلکہ دو ویگنیں بھی اندر آئیں، ان گاڑیوں میں پتھر لدے ہوئے تھے، انہوں نے آتے ہی یلغار شروع کردی پھر کچھ افراد بھی انکے ساتھ تعاون کرنے آگئے جو بظاہر سرکاری لوگ تھے انکا منصوبہ یہ تھا کہ بروہی کے آنے سے قبل ہی انکو تتر بتر کردیا جائے، ہمارے رضا کار بھی حصار کے اندر جوابی کاروائی کرتے رہے یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ اے کے بروہی پہنچ گئے وہ پروٹوکول کے ساتھ آئے تھے اس لئے پولیس کو وہ سب بلوائی نکالنے پڑے، اس موقع پر بروہی نے بہت اچھی تقریر کی، یہ میرا جمعیت کے ساتھ پہلا ایکسپیرئنس تھا، تاسب دیکھا جائے تو ہمارے ہاں سیاست میں تشدد کے حوالے سے اسلامی جمعیت طلبہ کا نام کافی نمایاں رہا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ میں نے پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں ۲۳ برس پڑھایا ہے اس دوران بھی اسلامی جمعیت طلبہ کافی متحرک تھی، میں نے کبھی ان سے نہیں چھیڑا انہوں نے میرے ڈسپلن کی وجہ سے مجھے کبھی ڈسٹرب نہیں کیا۔

''کمیونسٹ پارٹی کے بزرگ رکن کاکا خوشحال خٹک، نے جگایا اور وضو کے لئے پانی لانے کو کہا''

جب انڈیا میں پہلی کمیونسٹ پارٹی بنی تو حسرت موہانی اس کے بانی رکن تھے، یہ لوگ مذہب سے بیزار نہیں تھے، پانچ وقت کی نمازیں بھی پڑھتے تھے، مجھے عملی طور اس طرح کا ایک تجربہ ہوا، یہاں لاہور میں ۱۱۴ میکلوروڈ پر کمیونسٹ پارٹی کا دفتر ہوا کرتا تھا، ہم راولپنڈی سے ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی کانگرس کرنے یہاں لاہور آئے، تب میں لاہور میں پہلی بار آیا تھا، ہم پانچ سات لوگوں کو کمیونسٹ پارٹی کے دفتر ہی میں رہنے کی جگہ دی گئی گرمیوں کے دن تھے اور ہم چھت پر چٹائیاں بچھا کر لیٹے ہوئے تھے، وہاں ایک بزرگ بھی ہمارے ساتھ موجود تھے، پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے رکن ہیں، کاکا خوشحال خاں خٹک انکا نام تھا ہوا یوں کہ صبح چار بجے کے قریب مجھے کسی نے جھنجھوڑا دیکھا تو وہ کاکا صاحب ہی تھے، انہوں نے کہا کہ مجھے پانی چاہیئے، تیسری منزل پر پانی نہیں تھا، میں نیچے گیا اور پانی کی بالٹی لیکر آیا، انہوں نے لوٹے میں پانی ڈال کر وضو کیا اور نماز پڑھی، میں پھر سو گیا۔ جب صبح اٹھ کر ہم دوست نیچے اتر کر آئے تو میں نے اس وقت پارٹی کے جنرل سیکریٹری فیروزالدین منصور سے پوچھا کہ دادا یہ کاکا جی تو نماز پڑھتے ہیں انہوں نے صبح صبح مجھے جگا دیا، انہوں نے کہا تو پھر کیا ہوا، وہ کمیونسٹ ہیں یا نہیں ہیں مجھے یہ بتاؤ انہوں نے اسکے خلاف کوئی بات کی ہے تمہیں اس سے کیا کہ وہ تو نماز پڑھتے ہیں یا نہیں، یہ جولڑائیاں پیدا ہوئیں یہ اس وقت کے بعد کی کہانی ہے جب اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی مخصوص انداز میں متحرک ہوئی۔

پیپلز پارٹی کے لوگوں نے بھی ہمارے جلسے اکھیڑے

ناقدین کا خیال ہے کہ بھٹو صاحب زیادہ مشاورت پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اپنی ذات میں ایک طرح کے آمر تھے، آپ کیا کہتے ہیں؟

میرا خیال ہے یہ بات درست ہے میرا انکے ساتھ زیادہ ذاتی تعلق تو نہیں رہا لیکن

انکے ساتھ خاص موقعوں پر رابطہ رہا یہ اس وقت کی بات ہے جب ایوب خان یہاں گول میز کانفرنس بلائی اس کے خلاف بہت ایجی ٹیشن شروع ہو چکی تھی، کانفرنس میں بھٹو صاحب مدعو نہیں تھے باقی سب سیاسی پارٹیاں بلائی گئی تھیں، مسٹر بھٹو لاہور فلیٹیز ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، ہماری پارٹی کے مولانا بھاشانی بھی لاہور ہی میں میاں افتخار الدین کے گھر قیام پزیر تھے وہاں پر ہماری میٹنگ چل رہی تھی کہ اس کانفرنس میں شرکت کی جائے یا نہیں، مولانا کو دعوت تھی لیکن ہم نے نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم بھٹو کو اپروچ کریں گے کہ ہماری دونوں پارٹیوں خیالات کس قدر ملتے جلتے ہیں (سوشلزم وغیرہ کے حوالے سے)، ہم اپنا ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنائیں گے، میں اور میجر اسحٰق (جو اس وقت ہمارے ساتھ نیشنل عوامی پارٹی میں تھے بعد میں انہوں نے کسان پارٹی بنائی) مسٹر بھٹو سے ملنے گئے، ہماری ان سے ایک گھنٹے ملاقات رہی اور ایک دوسطری معاہدہ ہوا جس میں ہم نے باہمی تعاون پر اتفاق کیا لیکن اس ردعمل کے ایکشن میں ہمارا کوئی کردار نہیں تھا۔ آخری دفعہ اس وقت واسطہ پڑا جب مسٹر بھٹو دور حکومت میں دو مرتبہ ہماری خانیوال کسان کانفرنس کی قناتیں کاٹ دی گئیں، پنڈال گرا دئے گئے یہ وہاں کی پیپلز پارٹی کے لوگوں کی حرکت تھی اور ہمارے ساتھ یہی سلوک وہاڑی میں بھی پیپلز پارٹی کے لوگوں نے کیا تھا ان کا کچھ اس قسم کا طرز عمل تھا۔

خودارادیت کی بجائے کوئی اور نعرہ لگایا تو دنیا کشمیریوں کا ساتھ نہیں دے گی

عابد حسن منٹو کشمیری ہیں اسی مناسبت سے کشمیریوں کی تحریک آزادی سے جڑے کچھ سوالات بھی کیئے انکا کہنا تھا کہ کشمیر میں لڑنے کے لئے اس طرح کی مذہبی جہادی تنظیمیں بنانا سخت افسوس ناک اقدام ہے، ہمارا موقف اس وقت (نوے کی دہائی میں جب جہادی تنظیمیں بنائی گئیں) یہ تھا کہ ایسا کرنے سے کشمیریوں کی حق خودارادیت کی تحریک کو شدید نقصان پہنچے گا، اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ آپ (پاکستان) کے پاس جو آزاد کشمیر ہے یہاں آپ نے کوئی تحریک اٹھائی نہیں آپ اسے بیس کیمپ کہتے ہیں یہاں تو لوگ پر امن زندگی بسر کر رہے ہیں تحریک تو مقبوضہ کشمیر والے چلائیں گے تو وہ اگر حق خودارادیت کی بجائے جہاد یا پاکستان کے نامکمل ایجنڈے کی بنیاد پر چلاتے ہیں تو پھر انکی دنیا میں لوگ حمایت نہیں کریں گے، دنیا میں لوگ صرف حق خودارادیت کی حمایت کرتے ہیں کسی کے دعوے کی وہ حمایت نہیں کرتے، یہاں لوگ شہ رگ کے دعوے کرتے ہیں ستر سال ہم شہ رگ کے بغیر کیسے گزارا کرتے رہے؟ میں مقبوضہ کشمیر میں ہاشم (معروف کشمیری حریت پسند) کے بیٹے کی شادی میں گیا تو دیکھا کہ وہاں جنگجو دو قسم کے تھے، ایک وہ تھے جو حق خودارادیت کے لئے برسرپیکار تھے اور دوسرے جہادی تھے، میری جن لوگوں سے ملاقات ہوئی وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ اس جہادی ایلیمنٹ کی وجہ سے انکی جدوجہد کو شدید نقصان پہنچا ہے، جب جہادی وہاں ایک آدمی کو مارتے ہیں تو انکی ساری سیاسی سرگرمی رک جاتی ہے، ہم ابھی تک اس معاملے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچے کہ آیا ہم کشمیر کو ایک وحدت مانتے ہیں اور اسکے باشندوں کا حق خودارادیت تسلیم کرتے ہیں یا نہیں ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا اور بعید نہیں کہ وہ آزاد ہونے کے بعد ہمارے ہی کے حق میں ووٹ دے دیں۔

گنگا ہائی جیکنگ کشمیری حریت پسندوں کی جینوین کوشش تھی وہ کسی کے ایجنٹ نہیں تھے

یہ بات غلط ہے کہ کشمیری نوجوان ہائی جیکرز ہاشم قریشی اور اشرف قریشی یا انکے لیڈرز انڈین ایجنٹ تھے، ہاشم اس واقعے سے پہلے بھی پاکستان میں آچکا تھا اس کے رشتے دار پشاور میں رہتے تھے ہاں یہ الگ بات ہے کہ جو بھی کشمیر سے یہاں آتا ہے تو انٹیلیجنس اسکو دیکھتی ہے ہاشم اور اشرف تو اس وقت 17/18 سال کے لڑکے تھے انکی پارٹی این ایل ایف میں بہت معتبر اور سنجیدہ لوگ موجود تھے مقبول بٹ کے ساتھ تو میرا بہت زیادہ میل جول رہا وہ ایک بہت مضبوط ارادوں کا اور پڑھا لکھا آدمی تھا، وہ کوئی جذباتی لیڈر نہیں تھا اس کے علاوہ ڈاکٹر فاروق بھی ایک پڑھا لکھا آدمی تھا اور وہ میری ایک کزن کا شوہر بھی تھا وہ سب لوگ ایسے نہیں تھے کہ کسی کے ایجنٹ بن جائیں یہ (طیارہ اغواء) ان لوگوں کی جینوئن ایفرٹ تھی، ان سے پہلے بھی اس جدوجہد میں، میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان وغیرہ جیسے اہم افراد تھے، یہ کوئی غیر سنجیدہ قسم کے ایجنٹوں کی پارٹی ہرگز نہیں تھی، افسوس ناک بات یہ ہے کہ مقبول بٹ کو یہاں بھی ایجنٹ کہا گیا اس مقدمے (گنگا) میں میرے بنیادی موءکل ہاشم قریشی کو سزا ہو گئی تھی، باقی سارے لوگوں کو زیادہ سزا نہیں ہوئی، ہاشم کو آفیشل سیکرٹ ایکٹ کے تحت چودہ برس کی قید سنا دی گئی، چار پانچ سال بعد ہم نے اسکی ایک اپیل سپریم کورٹ میں کی، اس اپیل کی سماعت کے وقت ہاشم نے کہا اگر میں باہر نکل بھی گیا تو کہاں جاؤں، ہندوستان والے کہتے ہیں کہ میں پاکستانی ایجنٹ ہوں، پاکستان والوں نے تو فیصلے میں لکھ دیا ہے کہ میں انڈین ایجنٹ ہوں، وہ اپیل یہاں سپریم کورٹ میں لگی اس سے قبل انکے خلاف سپیشل ٹریبونل نے فیصلہ دیا تھا، یہ چار سو صفحات پر مشتمل فیصلہ تھا، گویا پوری کتاب تھی میں جب وہ کھول کر پڑھنے لگا تو تینوں ججوں نے بیک زبان کہا کہ یہ تو بہت لمبی کتاب ہے جو آپ نے پڑھا ہے ہم اسکی بنیاد پر حکومت سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ آپ کی اس اپیل کی مخالفت کرتے ہیں یا نہیں، دوسری جانب حکومت نے یہ اپیل کر رکھی تھی کہ جو رہا ہوئے ہیں انہیں زیادہ سزا اور ہاشم کو پھانسی کی سزا دی جائے پھر کیس ایڈجرن ہوا اس وقت حکومت کے ڈپٹی اٹارنی جنرل نے کہا کہ ہم حکومت کی جانب سے کی گئی اپیل واپس لے لیتے ہیں یہ (ہاشم) اپنی اپیل واپس لے لیں انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ ہم اپیل تو واپس نہیں لے سکتے کیونکہ ہم تو یہ اپیل کر رہے ہیں کہ ہماری کنوکشن جس بنیاد پر ہوئی ہے وہ غلط ہے اور یہ الزام ہمارے اوپر سے ہٹایا جائے، پھر یہ فیصلہ ہوا کہ میں فیصلے کے متعلق ایک فیکچویل ڈرافٹ بنا کر کورٹ میں پیش کروں وہ میں نے بنا کر پیش کر دیا اسی کی بنیاد پر انہوں نے فیصلہ کر دیا اور اس میں فیورایبل بات لکھ دی۔

سی پیک بننے سے مستقبل کا نقشہ بدل رہا ہے، پاکستان کو اپنا ذہنی نقشہ بھی بدلنا ہوگا

پاکستان کے حکمرانوں نے عملی طور پر تو ان سارے علاقوں کو اپنا باج گزار بنایا ہوا ہے آزاد کشمیر جہاں انکا اپنا آئین اور اسمبلی بھی ہے وہاں حقیقت میں حکومت تو پاکستان اور اسکے چار افسروں کی ہے مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اقدامات اور سیاسی موقف میں تضادات ہیں، سی پیک کے بننے کے راستے میں جتنے علاقے یا یونٹ ہیں وہ سب چاہتے ہیں کہ سی پیک ان کے علاقوں بنے تاکہ معاشی ترقی ہو اور وہاں کے عوام مستفید ہوں اسی لئے سی پیک بننے سے نقشہ تو بدلے گا لیکن اس دوران پاکستان کو اپنا دماغی نقشہ بھی بدلنا پڑے گا کہ انہوں نے گلگت بلتستان کا معاملہ کیسے حل کرنا ہے، جب آپکا فیصلہ ہے کہ یہ کشمیر کے مسئلے کے ساتھ جڑا ہوا ہے تو آپکو انکے ساتھ

بات چیت کر کے کوئی معاہدہ کرنا چاہیے، مقامی باشندوں کو اس میں شامل کیا جائے اور سی پیک کا معاشی فائدہ حقیقی طور پر مقامی عوام کو پہنچے ورنہ یہ جھگڑے ختم نہیں ہونگے۔

کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لئے پاکستان اور بھارت دونوں کو لچک دکھانی ہوگی

ہندوستان نے کشمیر کے ایک حصے پر قبضہ کر رکھا ہے دوسرا حصہ پاکستان کے پاس ہے یہ جو قبضے کے معاملات ہیں نہ تو یاسین ملک کے کہنے سے درست ہوسکتے ہیں نہ کسی اور کے، یہ نہیں ہوسکتا کہ پاکستان کا کشمیر ہندوستان کے حوالے ہوجائے اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ ہندوستان کے زیر قبضہ کشمیر پورے طور پر نکل کر پاکستان کے ساتھ آجائے، ہاں زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ کشمیریوں کا بھارت سے تعلق Re-determin ہوجائے کشمیر کو جوڑ کر ایک خودمختار ریاست بنانا تبھی ممکن ہوگا کہ پاکستان اس بات پر راضی ہو، یہ پاکستان کی رولنگ کلاس کا سوال ہے اگر یہ خود تیار نہیں تو ہندوستان کو کیسے کہا جاسکتا ہے بلکہ خود کشمیریوں کو کیسے کہا جاسکتا ہے، دیکھیں مقبوضہ کشمیر کے اندر موجود کشمیریوں کو اپنی جدوجہد کے لئے کوئی سیاسی موقف لینا پڑتا ہے اگر وہ یہ کہیں کہ ہم پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں تو انکو وہاں کون سیاست کرنے دیگا۔

عدلیہ کا انحطاط مارشل لاء دور سے شروع ہوا حاکم قوت کے ساتھ مفاہمت مسئلے کی بنیاد ہے۔

عدلیہ کی حالت زار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ پاکستانی عدلیہ میں انحطاط مارشل لاؤں کے زمانے سے شروع ہوا جب عدلیہ نے مارشل لاء کو justify کرنے کے لئے فیصلے کرنے شروع کئے تو غیر جمہوری وغیر آئینی قوتوں کے ساتھ مفاہمت کرنی پڑی، اس کے لئے آپ کئی بہانے تراش سکتے ہیں مثلاً حالات خراب تھے یا پھر سول انتظامیہ فیل ہوچکی تھی، ہمارا تو اکیس یہ ہے کہ آپ سول اداروں کو مضبوط کرنے کے عمل کا حصہ بنیں، آپ فیصلہ وہ دیں جو سول ایڈمنسٹریشن کو مستحکم کرے نہ وہ جو دوسری قوتوں کو طاقتور بنائے۔ جب آپ ایک حاکم قوت کے ساتھ مفاہمیت کرنا شروع کرتے ہیں تو پھر آپ کسی کے ساتھ بھی مفاہمت کرسکتے ہیں، حاکم قوتیں سیاسی ہوں یا غیر سیاسی کوئی پتا نہیں ہوتا کہ وہ کس وقت کس ادارے سے کیا چاہتی ہیں جب آٹھ ججوں میں سے ایک کو اٹھا کر چیف بنایا جاتا ہے تو اس کے پیچھے بھی کوئی ''حکمت'' ہوتی ہے۔

عدلیہ کی بہتری میں بنیادی ذمہ داری بار ایسوسی ایشنوں کی ہے

عدلیہ کے کردار میں شفافیت ممکن بنانے میں بڑا کردار بار ایسوسی ایشنوں کا ہے اس وقت پاکستان میں دو لاکھ کے قریب وکیل ہیں، بار ایسوسی ایشنز بہت منظم ہیں انکے انتخابات بھی باقاعدگی سے ہوتے ہیں، پاکستانی سیاست میں بھی بہت دفعہ انکا اچھا کردار آپ نے دیکھا ہے، ضیاء الحق کے مارشل لاء کے زمانے میں ہم نے جو تحریک چلائی تھی وہ اسکی مثال ہے لیکن جونہی ہم بحرانوں سے نکلتے ہیں تو یہاں بھی وہی فائدہ اٹھانے، قبضہ کرنے، اپنے لوگوں کو آگے لانے کی کشمکش نظر آنے لگتی ہے، اب تو ڈی جنریشن اتنی ہونے لگی ہے کہ ہم سنتے ہیں کہ وکیلوں نے مجسٹریٹ کو کمرے میں بند کرکے مارا، پولیس اہلکاروں کی مار پیٹ ہوئی وغیرہ، وغیرہ، یہ افسوسناک بات ہے اگر بار ایسوسی ایشنز سختی سے اس بات کار بند ہوجائیں کہ وہ قانون کی بالادستی اور آئین کی پاسداری کے رہیں گے تو حالات میں بہتری آسکتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر سماج میں ہی سب کچھ بکھرا ہوا ہے تو اس کو ٹھیک کرنا آسان نہیں ہے مگر کم از کم اپنے ادارے کی حد تک کچھ نہ کچھ بہتری لائی جاسکتی ہے۔

میں کامیاب وکیل ہوں مگر اس میں پیسے کا کوئی کردار نہیں

(مسکراتے ہوئے) دیکھیں آپکی اطلاع کے لئے میں ایک کامیاب وکیل تھا، تیں چالیس سال تو میں کامیاب ہی رہا ہوں، لیکن میں نے پیسے نہیں کمائے میری پارٹی کے اندر بھی بعض لوگوں کو شبہ ہوجاتا ہے کہ میں تو کروڑ پتی ہوں، میں نے ان سے کہا میں نے وکالت شروع کرتے ہی یہ فیصلہ کیا کہ میں نے کارخانے دار کا مقدمہ مزدور کے خلاف نہیں لڑنا اور مزدوروں کے مقدمے مفت کرنے ہیں، کوئی مزدور یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس سے پیسے لئے ہیں تو آپ مجھے بتادیں کہ میں کروڑ پتی کیسے ہوسکتا ہوں، اس کے باوجود میں کامیاب وکیل ہوں اس میں پیسے کمانے کا کوئی کردار نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے وکالت کرنے کے طریقے اور دیانت کو جج تسلیم کرتے ہیں۔

میٹنگ میں شریف الدین پیرزادہ نے بتایا کہ انہوں نے فلاں فلاں جج پہلے ہی رام کرلئے ہیں

میں جب نیا نیا سپریم کورٹ کا وکیل بنا تو ایک مقدمے میں شریف الدین پیرزادہ کے ساتھ جونیئر وکیل کے طور پر تھا، انہوں نے مجھے اسلام آباد بلالیا، وہاں ہماری میٹنگ تھی، دو تین اور وکیل بھی موجود تھے بات چیت مقدمے کے بارے میں ہوئی مگر اسکے حقائق اور قوانین کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی پیرزادہ صاحب نے یہی بتایا کہ ان پانچ ججوں جن نے کل ہمارا فیصلہ کرنا ہے، ان میں سے کن کن کو انہوں نے رام کرلیا ہے، میں اس میٹنگ میں اکیلا تو نہیں تھا سب سن رہے تھے۔

ڈکٹیٹر مشرف کی نہیں فیڈریشن کی وکالت کی تھی

مشرف دور میں ایک مقدمے کی پیروی پر سوال اٹھایا تو ردعمل کچھ یوں تھا: نہیں میں آرمی کا کبھی وکیل نہیں رہا صرف ایک سرکاری مقدمہ کیا وہ قومی احتساب بیورو کے قانون کے حوالے سے تھا، نیب آرڈیننس جب ۹۹ء میں نافذ ہوا تو اس کو مختلف لوگوں نے چیلنج کیا چیلنج کرنے والے یہاں کے سیاسی لیڈر نواز شریف، اسفندیار ولی وغیرہ بھی تھے انکا موقف تھا کہ یہ بنیادی حقوق کے خلاف ہے اور ہمارے خلاف سیاسی بنیادوں پر جاری کیا گیا ہے فیڈریشن نے مجھ سے کہا کہ آپ ہماری طرف سے پیش ہوسکتے ہیں میں نیب کی طرف سے پیش نہیں ہوا تھا، میں نے فیڈریشن سے کہا کہ اس آرڈیننس میں جو خرابیاں قانون اور بنیادی حقوق کے خلاف ہیں انکا دفاع میں نہیں کروں گا اگر آپ اجازت دیں تو پہلے ہی انکو لکھ کر دیتے ہیں کہ یہ چیزیں ہم ٹھیک کرکے دینے کے لئے تیار ہیں، نیب کے آرڈیننس میں خاص طور یہ بھی لکھا تھا جو حاضر سروس فوجی سول انتظامیہ میں آکر کام کرتے ہیں انکا احتساب بھی کیا جاسکے گا میں نے سوچا کہ اتنا بڑا قانون آج تک نہیں بنا ہے اس لئے میں اس کا دفاع کروں گا، یہ سارا کام کرنے سے پہلے میں

نے اپنی پارٹی سے رابطہ کیا کہ کیا میں یہ مقدمہ کروں یا نہ کروں، ہماری پارٹی نے نیب بننے سے پہلے ایک قرارداد پاس کی تھی کہ احتساب سب کا ہونا چاہیئے اور اس کے لئے قانون بنا چاہیئے، سو میری پارٹی نے مجھے اجازت دے دی پھر جو فیصلہ ہوا اس کے پہلے صفحے پر میرا یہ بیان درج ہے کہ ہم اس میں موجود خرابیوں کو ختم کرنے کے لئے تیار ہیں۔

''فوجی عدالتیں پارلیمنٹ کی آئینی ترمیم سے بنی ہیں،
پوچھنا چاہیے کہ سول انتظامیہ کیوں فیل ہے''

پہلا سوال یہ ہے کہ یہ عدالتیں کس نے بنائی ہیں، ظاہر ہے آئینی ترمیم ہوئی ہے جو پارلیمنٹ نے کی ہے اب پارلیمنٹ اس بات کا جواب دے کہ جس سسٹم کو چلانا سول انتظامیہ کا کام ہے وہ کیوں فیل ہے آپ نے پچھلی مرتبہ فوجی عدالتیں بنانے سے لیکر اس وقت تک نارمل جوڈیشل جیورس ڈکشن کو مضبوط کرنے یا بہتر کرنے کے لئے کیا اقدامات کئے، اصل میں معاملہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی سول عدالت ثبوتوں کے بغیر کسی کو سزا نہیں دیگی یہ قانون ازل سے ہے کہ شک کا فائدہ ملزم کو جائیگا اور شک سے مراد ادنی ترین شک ہے ان ساری باتوں کی اس وقت نفی ہو جاتی ہے جب آپ کہتے ہیں کہ ایسی عدالت ہونی چاہیے جو جنرل پرسپشن کے مطابق لوگوں کو سزا دیدے اب سزا اور جزا کا معاملہ یہ ہے کہ لوگوں کو اب خوشی نہیں ہو رہی کہ آپ سزائیں نہیں دے رہے ہیں، لوگوں کی پرسپشن یہ ہے کہ سزا ہونی چاہیئے اور آپ نہیں دے رہے یہاں تین چوتھائی مقدمات کا تعلق سیاسی اثرات سے ہے لیکن آپ چاہتے ہیں کہ سب لوگوں کو سزا دی جائے، چونکہ آپ نے سب لوگوں کو یہ سکھایا ہوا ہے کہ لوگوں کو سزا ہونی چاہیئے اس قسم کی سزا تو فوجی عدالت ہی دی سکتی ہے فوجی عدالت اس لئے تو نہیں بنائی گئی کہ انصاف دیا جائے یہ عدالت اس لئے بنائی گئی ہے کہ لوگوں کو سزائیں دی جائیں اسکا اعلان ہی یہی ہے کہ (سول عدالتوں سے) سزائیں نہیں ہوتیں۔

ضیاء الحق کا دور دو وجوہات کی بنا پر سب سے برا تھا

ضیاء الحق کا دور پاکستان کی تاریخ کا سب سے برا دور ہے، ایک تو ضیاء الحق فوجی آمر تھے دوسرا اس لحاظ سے کہ وہ ڈکٹیٹر ہونے کے ساتھ اپنے کسی نظریاتی مشن پر بھی تھے اس ملک کے بارے میں وہ اپنے اس مشن کے ساتھ مخلص تھے؟ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ دیانتدار آدمی تھے، کیونکہ جو آدمی کسی کے کہنے پر مشرق وسطی میں جا کر مسلمانوں کو قتل کر سکتا ہے اس کے اسلام کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے اس نے مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور بدقسمتی سے اس کی باقیات اب تک موجود ہیں۔

فیدرل کاسترو اور قائداعظم پسندیدہ شخصیت ہیں

''ستار اور ہارمونیم بجاتا رہا، کلاسیکی موسیقی سنتا ہوں'' ''استنبول اور لاہور پسندیدہ جگہیں ہیں''

پسندیدہ شخصیت کے بارے میں استفسار پر کہا کہ پاکستان میں جناح صاحب اور سامنے دیوار پر قائداعظم کی تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ دونوں تصویریں سوٹ والی ہیں، دوسری تصویر میں ڈوبرمین اور ایک روسی کتا بھی موجود ہے دونوں انکے پاس ہیں اور انکے منہ میں سگار ہے، میں ان قائداعظم کو تو مانتا ہوں بعد میں جو انکو ٹوپی اور اچکن پہنائی گئی مجھے وہ قبول نہیں دنیا میں پسندیدہ شخصیات میں سے آخری فیدل کاسترو تھے، جنہوں نے ایک چھوٹے سے ملک کو بیشمار مشکلات، معاشی ناکہ بندیوں اور دباؤ کے باوجود قائم رکھا اور اپنے نظریات پر سمجھوتہ نہیں کیا، ویسے بھی کتابیں بہت پڑھتا ہوں ایک چھوٹی سی کتاب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اسکا نام کمیونسٹ مینی فیسٹو ہے، موسیقی سے کسی زمانے میں بہت شغف رہا، ستار اور ہارمونیم بجاتا تھا، استاد فیاض خان، استاد عبدلکریم خان، اور روشن آرا بیگم، میرے پسندیدہ گانے والے تھے، کالج کے زمانے میں فلمیں بہت دیکھتا تھا، سعادت حسن منٹو کی کہانی ٹوبہ ٹیک سنگھ پر بنی فلم بہت پسند آئی تھی، پاکستان میں جب مسٹر بھٹو کا دور نسبتا بہتر لگا گو کہ اس کے بعد کچھ آمرانہ اقدامات بھی کئے بہرحال وہ ایک سیاسی حکومت تھی ضیاء الحق کا دور بدترین تھا، ترکی کا دارالحکومت استنبول بہت پسند ہے اور پاکستان میں لاہور، لیکن لاہور کے تہذیبی کلچر کو تباہ ہوتے دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے

شہید نظیر عباسی کی 37 ویں برسی

عوامی ورکرز پارٹی لاڑکانہ یونٹ کی جانب سے شہید نذیر عباسی کی ۳۷ ویں برسی کے موقعہ پر ایک پروگرام منعقد کیا گیا، پروگرام میں کامریڈ مجیب پیرزادہ، خان عبدالغفار خان و دیگر مقررین شہید نظیر عباسی کی جدوجہد پر روشنی ڈالی مقررین نے انکو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس عزم کیا اظہار کیا کہ عوامی ورکرز پارٹی کا ہر کارکن اسی جذبہ اور بہادری کے ساتھ انکے مشن کو جاری رکھے گا۔

عوامی ورکرز پارٹی گھوٹکی کی جانب سے شہید نذیر عباسی کی 37 ویں برسی کے موقع پر ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا، پروگرام میں کارکنوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ عوامی ورکرز پارٹی سندھ کے صدر کامریڈ بخشل تھلو نے خطاب کرتے ہوئے شہید نذیر عباسی کی زندگی اور جدوجہد کا سرخ سلام پیش کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ نذیر عباسی کی شہادت کی تحقیقات کے لئے آزاد عدلیہ کا کمیشن مقرر کیا جائے تا کہ ان پر کئے گئے ظلم و تشدد زیادتی اور شہادت کے اصل حقائق عوام کے سامنے آ سکے۔

عوامی ورکرز پارٹی پنجاب کی ایگزیکٹو کمیٹی کا ایک اجلاس مورخہ ۱۳ اگست کو پارٹی آفس لاہور میں صوبائی صدر جناب عالم سجاد کی صدارت میں منعقد ہوا، اجلاس میں تنظیمی صورتحال اور شعبہ جاتی امور پر بحث کی گئی اجلاس میں مندرجہ ذیل فیصلے کئے گئے۔

(1) کامریڈ غلام دستگیر کے لئے ایک ریفرنس راولپنڈی میں منعقد کیا جائیگا۔

(2) اکتوبر پر انقلاب ۱۰۰ سالہ تقریب کے سلسلے میں اکتوبر کے آخری ہفتہ میں پروگرام منعقد کیا جائیگا۔

(3) سندھ میں جبری گمشدگی کے شدید الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ تمام افراد کو فوری بازیاب کرایا جائے۔

وفاقی سیکریٹری جنرل جناب اختر حسین ایڈوکیٹ نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ سیاسی صورتحال اور اسٹبلشمنٹ کے تضادات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پارٹی کی سرگرمی کو تیز کرنا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ پروگرام منعقد کرنا چاہیے۔ (رپورٹ: خان غفار خان)

سپریم کورٹ کے فیصلہ کو دونوں طرح سے دیکھا جا سکتا ہے: اسے متوقع فیصلہ بھی کہا

اقتدار کی جنگ

تحریر: بابر ایاز

جاسکتا ہے اور غیر متوقع بھی۔ ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا تھا کہ تمام تر شور شرابہ کے بعد بھی پاناما منی لانڈرنگ کیس سماعت کے لیے احتساب عدالت ہی کے حوالے کیا جائے گا۔ اگر سپریم کورٹ شروع ہی میں جب بعض سیاست دانوں نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا، آرٹیکل (3) 184 کے تحت اختیار کو استعمال کرنے کی بجائے اور بنیادی حقوق کے تحت منصفانہ سماعت، جیسا کہ آئین کے آرٹیکل 10A میں درج ہے، کے حق کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے یہ فیصلہ کر دیتی تو قوم کو پریشانی، وقت اور پیسے کے ضیاع سے بچایا جاسکتا تھا۔

فیصلے کا غیر متوقع پہلو، اس معمولی سی دانستہ یا نادانستہ غلطی پر آرٹیکل (f) 62 کے تحت وزیراعظم کی نااہلی ہے کہ انھوں نے الیکشن کمیشن میں کاغذات نامزدگی داخل کراتے وقت 10,000 درہم کی قابلِ وصول تنخواہ کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ یہ تنخواہ ان کی طرف سے اس کمپنی کی جانب سے قابل وصول تھی جو ان کے صاحبزادے نے دبئی کے ڈیوٹی فری ایریا میں قائم کی تھی۔ فاضل عدالت نے اس کی تشریح اثاثے چھپانے کے طور پر کی۔ ٹیکس قوانین کے تحت اگر کوئی شخص اپنے لین دین کا حساب کتاب کیش کی بنیاد پر رکھتا ہے تو پھر قابل وصول کو اثاثہ تصور نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم سپریم کورٹ کو ان قوانین کی نئے طریقے سے تشریح کا پورا اختیار ہے اور فاضل جج صاحبان کی فہم وفراست پر سوال نہیں اٹھایا جاسکتا۔

میری عاجزانہ رائے یہ ہے کہ وزیراعظم اور ان کے اہل خانہ پر کسی نچلی عدالت میں پاناما لیکس منی لانڈرنگ کیس کا مقدمہ چلایا چاہیئے تھا تاکہ اگر فیصلہ ان کے خلاف آتا تو انھیں اپیل کے لیے اعلیٰ عدالتوں سے رجوع کرنے کا شفاف موقع ملتا۔ اسی کو مقدمے کی منصفانہ سماعت کا حق کہا جاتا ہے۔ بادی النظر میں یوں لگتا ہے کہ نواز شریف اور شہباز شریف کے والد نے دبئی میں اسٹیل مل خریدنے کے لیے جو رقم بھیجی تھی، اس کے لیے بینکنگ کا مناسب چینل استعمال نہیں کیا تھا، یہی وجہ ہے۔

کہ وہ اس پوری زنجیر کی پہلی کڑی فراہم نہیں کرسکے۔ یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ 80 کی دہائی میں یہ رقم فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹس (FEBCs) کے ذریعے بھیجی گئی ہو۔ یہ وہ طریقہ تھا جو ڈاکٹر محبوب الحق نے 80 کی دہائی میں موجود غیر ملکی زرمبادلہ کو کنٹرول کرنے کے سخت قوانین کو آسان بنانے کے لیے متعارف کرایا تھا۔

اگر شریف خاندان کے خلاف احتساب عدالت میں منی لانڈرنگ کا کیس ثابت ہو جاتا تو انھیں بجا طور پر سزا دی جاسکتی تھی۔ اور پھر اس کے نتیجہ میں انھیں الیکشن کمیشن کی جانب سے درست طریقے سے نااہل قرار دیا جاسکتا تھا۔ تمام مہذب ملکوں میں ایسے منتخب نمائندوں کو جنھیں کسی اخلاقی برائی کی پاداش میں سزا سنائی جائے کوئی بھی عوامی عہدہ رکھنے سے روک دیا جاتا ہے

اس قسم کے مقدمات میں صرف فلسفہء قانون ہی کا معاملہ درپیش نہیں ہوتا۔ معاملہ قانونی ہو یا اس کا تعلق قرآن پاک یا روایت کی مذہبی تشریح سے ہو، تشریح انفرادی سوچ پر مبنی چلی آ رہی ہے۔ یادداشت تازہ کرنے کے لیے اسلامی فقہ کے ارتقاء پر سرسری نظر ڈالیے۔ ہمارے پاس پانچ بڑے "فقہ" ہیں جو اسلامی فلسفہء قانون کی بنیاد ہیں اور دنیا بھر کے مسلمان انھیں قبول کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ (150-80 ہجری)، امام مالک بن انس (179-94 ہجری)، امام الشافعی (204-150 ہجری)، امام احمد بن حنبل (204-164 ہجری) اور امام جعفر صادق (148-80 ہجری) کی طرف سے ایک قرآن اور لاتعداد روایات (شریعہ) اور احادیث کی تشریح بیان کی گئی۔ اگرچہ ان میں سے بعض کے درمیان استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا مگر اس کے باوجود انھوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا۔ (ان مختلف تشریحات سے پیدا ہونے والی تقسیم نے مسلمانوں کو متعدد فرقوں میں بانٹ دیا جو بعض اوقات اپنے نظریاتی جھگڑے پرتشدد طریقے سے طے کرتے ہیں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ تمام مذاہب حتیٰ کہ سماجی اور سیاسی نظریوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا)۔ حکمرانوں نے اس تقسیم کا پورا فائدہ اٹھایا۔ مثال کے طور پر تلخ گو صوفی منصور الحلاج کے مقدمے میں "جن دو ججوں نے معاملے پر غور کے لیے کہا تھا وہ خود اس رائے کو مسلمہ معیار سے انحراف سمجھتے تھے مگر انھوں نے ان قانونی نتائج سے اختلاف کیا جو الحلاج کی دستاویز کی ملکیت سے سامنے آئے۔ ان میں سے ایک نے جو حنفی تھا، فیصلہ دیا کہ یہ صوفی بزرگ مسلمہ نظریات سے انحراف سے لاتعلقی ظاہر کر کے سزا سے بچ سکتا ہے۔ مگر دوسرے نے جو مالکی تھا قرار دیا کہ اس کی مخلصانہ معذرت (رشدی کی طرح) بھی قبول نہیں کی جا سکتی اور سزائے موت کا مستحق ہے۔ خلیفہ المقتدر کے وزیر نے مالکی تشریح کو استعمال کیا، چنانچہ وہ شخص جو ہماری مذہبی داستانوں میں حق گوئی کی علامت تھا، ختم کر دیا گیا۔

ہمارے آئین کے ساتھ بھی اسی قسم کا مسئلہ ہے جو اس تحریری دستاویز کی جو لگ بھگ 45 سال پرانی ہے، تشریح کرنے والوں کو بہت زیادہ گنجائش دیتا ہے۔ جبکہ مذہبی روایت کے معاملہ میں اولین تشریح، زبانی وحی اور روائتی تاریخ کے تقریباً ایک سو سال بعد سامنے آئی۔

(بقیہ صفحہ نمبر 19)

پاکستان کی ریاست کے منفی کردار پر بات کرنا اس لئے ضروری ہے کیونکہ ریاست

پاکستان کے ستر سال، ریاست کا صنفی کردار

تحریر: عصمت شاہ جہان

نے صنفی مساوات تو دور کی بات، بنیادی ضروریات کی فراہمی تک کی ضمانت نہیں دی ہے اور باقاعدہ طور پر ملک کے شہریوں کے خلاف ہر طرح کے جبر و امتیاز روا رکھا ہوا ہے، خاص طور پر عورت کے معاملے میں، وقت کے ساتھ ریاست قومی سلامتی نظریے اور وسیع تر قومی مفاد کی آڑ میں عوام کے بنیادی مسائل کے حل اور سماجی انصاف کی ذمہ داریوں سے خود کو مستثنیٰ کر چکی ہے، فوج اسلحہ کی خریداری، کاروبار اور جنگوں کے ٹھیکوں پر عوامی وسائل خرچ کئے جا رہی ہے اور عوام رل رہے ہیں، بجلی گیس، تعلیم و روزگار، رہائش و علاج کی فراہمی اور جان و مال اور آبرو کی حفاظت تو دور کی بات، یہ ریاست تو عوام کو پینے کے صاف پانی فراہم کرنے کے ذمہ داری تک سے بھی خود کو مستثنیٰ کر چکی ہے، کسی بھی قیمت پر سرمائے اور زمینوں کا حصول اس ریاست کا مقصد رہا ہے، مسائل میں گھری عوام خاص طور پر عورتیں اپنی مدد آپ کے نظریے کے تحت ملکی اور غیر ملکی این جی اوز کے ہتھے چڑھ چکی ہیں، این جی اوز کی اعزازیہ کی روایات کی عادی عورتیں، اب سیاسی شرکت کے بدلے بھی اعزازیہ کی طلبگار ہیں، اور عورتوں کی کسی رضا کارانہ مزاحمتی تحریک کا حصہ بننے کے لئے بشمکل راضی ہوتی ہیں۔ اس صورت کے نتیجے میں عوام ایک بڑے فکری مغالطے کا شکار ہیں اور اب وہ ہر رضا کارانہ فیمنسٹ مزاحمتی تحریک کو این جی او کی کارروائی سمجھتے ہیں۔

گوکہ پاکستان کا آئین عورت کے خلاف امتیاز کی اجازت نہیں دیتا مگر اسکے خاتمے کی کوئی ضمانت بھی نہیں دیتا۔ عورتوں کو مساوی حقوق اور تحفظ کا آئینی حق صرف ایک رسمی شق تک محدود ہے، درحقیقت عورتوں کی اکثریت جنسی معاشی محتاجی، سماجی اور ثقافتی پسماندگی کا شکار ہیں، وہ اس پوزیشن میں ہی نہیں ہیں کہ ان رسمی حقوق کو حاصل کر سکیں، اور نہ ہی ریاست اور حکومت نے اس آئینی وعدے پر عملدرآمد کے لئے کوئی ضروری اقدامات اٹھائے ہیں۔

پاکستان کی ریاست نے پچھلے 70 سالوں میں صنفی مساوات کے لئے جو آئینی اور قانونی اقدامات کئے اس کا کل تخمینہ یوں ہے، اسمبلیوں اور مقامی حکومتوں میں عورتوں کی مخصوص نشستیں، ویمن کمیشن اور عورتوں کی ترقی کی وزارت کا قیام، بالائی طبقے کی چند عورتوں کو سیاسی اور حکومتی عہدے، فیملی لاء اور فیملی کورٹ کا قیام، چند بڑے شہروں میں ویمن پولیس ڈیسک، ویمن سٹڈی سینٹرز اور ویمن بینک کا قیام، عورتوں پر تشدد اور جنسی ہراسگی کی روک تھام کے لئے قانونی طریقہ کار میں چند تبدیلیاں اور سرکاری اداروں میں عورتوں کی ملازمت کا محدود کوٹہ، ان سطحی اقدامات میں سے زیادہ تر فوجی ڈکٹیٹروں نے دنیا کو اپنا سافٹ امیج دکھانے کے لئے کئے۔ اور وہ بھی مؤثر جمہوری نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے فعال اور سرانجام نہیں کی جا سکیں، عورت کی صورتحال اس بات کی گواہ ہے کہ یہ اقدامات عورت کی غلامانہ حیثیت کے ڈھانچے کو ختم کرنے اور عورت کو صنف، قوم، طبقے اور مذہب کی بنیاد پر درپیش جبر و استحصال کا حل پیش نہیں کرتے، بلکہ الٹا لمبے عرصے تک اسے برقرار رکھنے میں آلہ کار رہے ہیں۔

ویسے تو ہمارے سماج میں عورت دشمن روایات کو ہمیشہ مذہب کا لبادہ اوڑھا کر پیش کیا جاتا ہے اور صنفی تفریق کو قدرتی اور مذہبی رنگ دیا جاتا ہے، مگر اسلامائزیشن کی پچھلی چار دہائیوں کے دوران ریاستی سطح پر بھی عورت کے پہلے سے محدود حقوق اور سماجی درجے کے خلاف منظّم طور پر بھرپور رجعتی مہم چلائی گئی، خاص طور پر مذہب کی مخصوص تاویلات کی بنیاد پر بیشمار امتیازی قوانین بنائے گئے، مثال کے طور پر قانون شہادت اور دیت میں عورت کی گواہی آدھی کر دی، اور مقتولہ کے رشتے داروں کو خون بہا کی ادائیگی اور قاتل کو معافی کے اختیار کو ریاستی پشت پناہی دی۔ حدود کے قوانین بنا کر عورتوں پر جنسی حملے کرنے والوں کو ریاستی تحفظ دیا گیا، عورت کے عوامی مقامات پر کھیلنے پر پابندی لگائی گئی، سرکاری دفاتر اور تعلیمی اداروں میں اسلامی لباس لازمی قرار دیا گیا۔ اسلامائزیشن کے دفاع کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل اور شریعت کورٹ بنائے، جنرل ضیاء کے بنائے گئے ان قوانین اور ضابطوں کے خلاف شہری عورتوں کی طرف سے زبردست مزاحمت آئی مگر ضیاء کے مرنے کے بعد جمہوری حکومتوں میں دم توڑ گئی۔ جاگیرداری اور مرد کی بالادستی کو قائم رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرنے والے اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت آج بھی اس سب کے دفاع کے لئے موجود ہیں۔ جمہوریت سے متصادم یہ قوانین اور ادارے عورت کی انسانی حیثیت اور مساوی حقوق کیلئے جدوجہد کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں

ریاست مذہبی فاشزم کے ذریعے طبقاتی، قومی اور صنفی جبر سے آزادی کی تحریکوں کو رستہ روکتی رہی ہے، اور سماج کو عمومی طور پر پسماندگی اور جہالت میں دھکیل رہی ہے، تمام عورت مخالف مذہبی بنیاد پرست دہشت گرد تنظیموں کو فوج اور بنیاد پرست سیاسی پارٹیوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے اور دوسری پاپولسٹ سیاسی پارٹیاں اپنے طبقاتی مفادات کی وجہ سے ان قوتوں کی مخالفت ہی نہیں کرتیں۔

عورت مخالف صنفی ذہن سازی اس ریاست کا خاصہ رہا ہے، سرکاری میڈیا اور سرکار سے لائسنس یافتہ پرائیویٹ میڈیا ہاؤسز عورتوں کی تصویروں، اشتہاروں اور فلموں سے تو سالانہ اربوں روپے کماتے ہے لیکن صنفی مساوات کے سوال پر مجرمانہ طور پر خاموش ہیں کیونکہ میڈیا ہاؤسز خود اسی منافع خور نظام کے ہونے سے ہیں اور کما رہے ہیں، اوپر سے کیبل کے نظام سے

شہروں میں ٹی وی پر دکھائے جانے والے عورت کے کرداروں کی دیکھا دیکھی اکثر شہری لڑکیاں بھی ان کرداروں کی طرح مرد کی گڑیا بننے کی متمنی ہوجاتی ہیں، ملکی خزانے سے رقوم فوج اور حکومت کرنے والی اشرافیہ اور ڈکٹیٹروں کا امیج بہتر کرنے کے لئے اشتہاری پروگراموں اور فلموں پر خرچ ائے جاتے ہیں مگر عورتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف سرکاری مہم پر نہیں، عورتوں میں قدامت پرستی پھیلانے کے لئے بھی کئی تبلیغی چینل چل رہے ہیں، درسی کتب نجی ملکیت اور تجارت کی تقدیس کے قصوں، مذہبی منافرت اور مردوں کی برتری اور بالادستی پر مبنی نظریات سے بھری ہیں، تعلیمی اداروں اور سرکاری لائبریریاں دقیانوسی، رجعتی اور جنس پرستی پر مبنی کتابوں اور رسائل سے بھری ہوئی ہیں۔

پاکستانی ریاست نہ صرف پاکستان میں صنفی جبر، عورتوں پر تشدد اور جنسی جرائم میں ملوث رہی ہے بلکہ ہمسایہ ممالک میں بھی ان جرائم میں ملوث رہی ہے، پاکستان کی ریاست نے افغانستان میں صنفی مساوات پر مبنی ثور انقلاب کو گرانے میں بہت بڑا عسکری اور سیاسی کردار ادا کیا، اس کے بعد افغان عورتوں کے ساتھ جو ہوا، اس بربریت کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ہے، بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے دوران دو لاکھ سے زیادہ عورتوں کو ریپ کیا، ہزاروں عورتوں کو اغوا کر کے فوجی کیمپس میں رکھا گیا، جہاں ان عورتوں پر مظالم ڈھائے گئے۔ ان مظالم میں جماعت اسلامی کے البدر اور الشمس کے دستے شریک تھے، ریاست نے آج تک پاکستان میں ریپ اور غیرت کے نام پر عورت کے قتل کے کسی مجرم کو سزا نہیں دی اور یہ عورت کے ساتھ انسانیت سوز سلوک ایک فریق کے طور پر کھڑی ہے۔ گھریلو تشدد تو بلا تفریق طبقہ ہر عورت کا مسئلہ ہے مگر ریاست اسے ''جرم'' ماننے کو تیار نہیں، عورتوں پر جنسی تشدد عام ہے جبکہ ریاست ریپ ثابت کرنے کے لئے ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی مانگتی ہے، وہ بھی باکردار چشم دید گواہ جو کہ ناممکن بات ہے۔

پاکستان کا آئین تضادات کا مجموعہ ہے، ایک طرف لکھا ہے کہ جنس کی بنیاد پر امتیاز نہیں برتا جائے گا، مگر دوسری طرف عورتوں کی زندگی سے جڑے تمام ریاستی قوانین، پالیسیاں اور اسکا ہر فقرہ صنفی امتیاز اور جبر پر مبنی ہیں۔ سارا کا سارا ریاستی نظام اوپر سے نیچے تک، مقننہ سے لیکر عدلیہ اور ایگزیکٹو تک نہ صرف صنفی امتیاز پر مبنی اور مذہبی قدامت پرستانہ ریاست کی بنیادی ضرورت رہی ہے اور اسکی نظریاتی اساس کے خمیر میں عورت سے غلامی اور اپنے مساوی حقوق سے دستبرداری کا زبردست جبری تقاضا موجود ہے، آئین قانون اور ریاست کے تمام ستون مرد کی بالادستی کو قائم اور فعال رکھنے میں مکمل طور پر ملوث ہیں۔

اس آئین، ریاستی نظریات و ڈھانچہ، اور قوانین کو ترقی پسند بنیادوں پر استوار کئے بغیر صنفی مساوات اور سماجی انصاف پر مبنی سماج کا قیام ممکن نہیں۔

☆☆☆

بقیہ اقتدار کی جنگ

اس وقت آئین، اُس وقت کے مقابلے میں جب اسے بنیادی نوعیت کی ترامیم کے بعد دیکھا جائے گا، ایک تازہ اور فعال دستاویز کی حیثیت سے موجود ہے۔ اس کے باوجود عدالتوں کو انتہائی واضح طور پر درج شقوں کی تشریح کے لیے کہا جا رہا ہے۔ مگر اب تک ہوشیار اور چالاک حکومت اس پھندے میں نہیں پھنسی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عہدِ جدید میں مذہبی قیادت نے کس طرح معاشرے کے ان تمام طبقات کو ناکام بنایا جنھوں نے 1979 میں جمہوری ایران کے انقلاب میں حصہ لیا تھا۔ ایرانی آئین میں ولایتِ فقیہ کے ادارے کے لیے کہا گیا ہے۔ "فقیہ عدل کی یہ نگہبانی، ہر حالت میں مسلسل امامت کی بنیاد پر ہے"۔ میرے محدود علم کے مطابق مسلم ریاستوں کی تاریخ میں اس قسم کے ادارے کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ "مذہبی نگہبان" اور اس کی کونسل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ متعدد امکانی امیدواروں کو اس بنیاد پر ایرانی پارلیمنٹ کا الیکشن لڑنے کے لیے نااہل قرار دے دے کہ وہ انھیں اتنا پرہیز گار اور مذہبی نہیں سمجھتی کہ عوام انھیں منتخب کریں۔ چنانچہ فیصلہ عوام پر نہیں چھوڑا جاتا بلکہ مذہبی قیادت کے ایک چھوٹے سے حلقے کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ مجھے یہ ادارہ وزیراعظم کو نااہل قرار دینے کے بارے میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے سے یاد آیا۔ اس فیصلے میں بعض شقوں کا حوالہ دیا گیا ہے، جس نے خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔ جنرل ضیاالحق نے جو خود کو ایک طرح سے ملک کا مذہبی نگہبان سمجھتے تھے، 1973 کے آئین کے آرٹیکل 62 اور 63 میں بعض متنازع شقیں شامل کر دیں۔ فاضل سپریم کورٹ کے فیصلہ تک آئین کی یہ شقیں غیر فعال رہیں کسی نے بھی ان شقوں کو فعال کر کے پارلیمان کے کسی رکن، صدر اور وزیر اعظم کی نااہلی کی استدعا نہیں کی تھی۔ اب جبکہ یہ شقیں فعال کر دی گئی ہیں تو کیا اعلیٰ عدلیہ ایران کی طرح مذہبی نگہبان کا کردار سنبھال لے گی؟ پاکستان مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کو اب اس بات پر افسوس ہونا چاہئے کہ جب وہ 18 ویں ترمیم پر کام کر رہی تھیں تو انھوں نے آرٹیکل 62 اور 63 کو ختم نہیں کیا۔ میں نے اُس وقت بعض ارکان پارلیمان کے ساتھ یہ معاملہ اٹھایا تھا مگر ان کا کہنا تھا کہ مذہبی جماعتیں اس معاملے پر غور کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے باوجود یہ دونوں پارٹیاں، مذہبی جماعتوں کے دباؤ میں آئے بغیر اور انھیں اختلافی نوٹ لکھنے کی اجازت دے کر ان دو شقوں کو ختم کر سکتی تھیں کیونکہ کمیٹی میں ان کی اکثریت تھی۔ اب بھی لبرل جماعتوں کو پارلیمنٹ میں مسلم لیگ (ن) کے ساتھ مل بیٹھنا چاہیئے تاکہ آئین سے ان دو متنازع شقوں کو ختم کیا جا سکے۔ انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ پی ایم ایل (این) کے وزیراعظم سے جو عمل شروع ہوا ہے وہ نہیں رکے گا اور ان کی قیادت بھی نااہل ہوجائے گی۔ یہ وقت نواز شریف کے چلے جانے پر شادیانے بجانے کا نہیں بلکہ اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنے کا ہے۔

☆☆☆

سندھ میں سہ فریقی لیبر کانفرنس کے لیئے تجاویز

ظہیر اختر بیدری

نیشنل لیبر کونسل کے زیر اہتمام 2 روزہ سندھ لیبر کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں 150 سے زیادہ ہاری اور مزدور رہنما شریک ہوئے۔ مزدوروں اور ہاریوں کی تنظیموں کی طرف سے کچھ اہم تجاویز کو حتمی شکل دی گئی یہ تجاویز آئندہ ماہ حکومت سندھ کو پیش کی جائیں گی۔ سندھ لیبر کانفرنس میں دیگر مزدور اور ہاری رہنماؤں کے ساتھ ساتھ ہیومن رائٹس کمیشن کی چیئر پرسن جسٹس ماجدہ رضوی اور پیپلز لیبر بیورو کے رہنما حبیب الدین جنیدی نے بھی شرکت کی۔ تجاویز میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ پاکستان کے 7 کروڑ مزدوروں اور ہاریوں کے لیے قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلیوں اور سینیٹ میں نشستیں مخصوص کی جائیں اور سیاسی جماعتیں مزدوروں اور ہاریوں کو جنرل نشستوں کے لیے ٹکٹ فراہم کریں اور آئی ایل او کے ان تمام کنونشنوں کی پاکستان کے مزدور قوانین کا حصہ بنایا جائے جن پر پاکستان نے دستخط کیے ہیں محکمہ محنت مزید لیبر انسپکٹروں خصوصاً خواتین لیبر انسپکٹروں کا تقرر کرے۔ کانفرنس میں کہا گیا کہ سندھ میں زرعی مزدور سخت بدحالی کا شکار ہیں اس کی اہم وجہ ان کی لیبر قوانین کے تحت ملنے والی مراعات سے محرومی ہے۔ لیبر کانفرنس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ زرعی مزدوروں اور ماہی گیروں کو بھی انجمن سازی کا حق دیا جائے اور ضلعی سطح پر ہاری کورٹس قائم کی جائیں۔ مزدوروں کو حکومت کی طرف سے منظور شدہ کم سے کم اجرت کی ادائیگی کو لازمی بنایا جائے۔ سرکاری اداروں میں محنت کشوں اور ہیلتھ ورکرز کے مسائل حل کیے جائیں، کانفرنس میں کہا گیا کہ گھروں میں کام کرنے والی خواتین حقوق سے محروم ہیں، ہوم بیسڈ ورکرز کو بھی مزدور قوانین کے مطابق سہولتیں فراہم کی جائیں۔ جسٹس ماجدہ رضوی نے کہا کہ کمیشن مزدوروں کو حقوق دلانے میں مدد کرنے کے لیے تیار ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لیبر کانفرنس میں پیش کی جانے والی تجاویز قابل تعریف ہیں۔ خاص طور پر اسمبلیوں میں مزدوروں اور ہاریوں کے لیے نشستیں مخصوص کرنے کی تجویز قابل تعریف ہے لیکن اس حوالے سے دو اہم امور کی نشان دہی ضروری ہے۔ ایک مزدوروں اور ہاریوں کی تعداد دوسرے اسمبلیوں میں مزدوروں اور ہاریوں کے لیے نشستیں مخصوص کرنا۔ پائلر مزدوروں کے مسائل پر تحقیق کرنے اور مزدور حقوق دلوانے کے لیے کام کرنے والا ادارہ ہے۔ پائلر کے ڈائریکٹر کرامت علی سے میں نے پچھلے دنوں پاکستان میں مزدوروں کی تعداد معلوم کی تو کرامت علی نے اپنی تحقیق کے مطابق مزدوروں کی تعداد ساڑھے چار کروڑ بتائی، ہاریوں اور کسانوں کی تعداد کا حتمی طور پر علم نہیں لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ زرعی معیشت سے جڑے ہاریوں اور کسانوں کی تعداد زیادہ ہونا چاہیے اور ان کی درست اور حقیقی تعداد کے مطابق ہی قانون ساز اداروں میں ان کی نشستوں کی تعداد کا تعین کیا جانا چاہیے، اس کانفرنس میں ہی نہیں بلکہ ہر مزدور کانفرنس میں یہ شکایت کی جاتی ہے کہ پاکستان میں لیبر قوانین پر عملدرآمد نہیں ہو رہا ہے، اس حوالے سے اس حقیقت کا ادراک ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں خاص طور پر شکاگو کے سانحے کے حوالے سے سرمایہ داروں اور صنعتکاروں نے مزدوروں میں بڑھتی ہوئی بے چینی کو روکنے کے لیے مزدور قوانین کا ہتھکنڈا استعمال کیا تاکہ مزدوروں کی طبقاتی جدوجہد کی ناک میں مزدور قوانین کی نکیل ڈال کر انہیں قابو میں رکھا جائے لیکن اس نظام کی خباثت کا عالم یہ ہے کہ یہ نظام اپنے بنائے ہوئے قوانین پر ہی عملدرآمد ہونے نہیں دیتا، کیونکہ قوانین پر عملدرآمد کرانے والے ادارے کرپٹ اور سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔ جب صورتحال یہ ہو تو مزدور قوانین پر عملدرآمد کا رونا حماقت ہی نہیں بلکہ غیر منطقی بھی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ محنت اور سرمائے میں حصہ داری کیا ہو، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مزدوری کی محنت کے بغیر پیداوار کا تصور ہی ممکن نہیں خواہ وہ مزدور کارخانوں، ملوں سے جڑا ہوا ہو یا کھیت اور کھلیانوں سے سرمایہ کا سرمایہ تو مختلف حوالے سے حاصل کیا جاتا ہے خواہ لوٹ مار کا موروثی ہو یا بینکوں کے قرض کی شکل میں لیکن محنت انسان کا وہ سرمایہ ہے جو سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار کا باجگزار بنا رہتا ہے، اصل مسئلہ نہ لیبر قوانین پر عملدرآمد کا ہے نہ اجرتوں میں اضافے کا اصل مسئلہ ہے پیداوار کے دو بنیادی عوامل محنت اور سرمایہ کاری کا، اس حوالے سے مارکس نے اس حقیقت کی نشاندہی ''قدر زائد'' کے حوالے سے کی ہے کہ مزدوروں کی اجتماعی محنت سے جو سرمایہ حاصل ہوتا ہے اس میں سے بمشکل ایک چوتھائی حصہ صنعتکار مزدوروں کو اجرت کی شکل میں ادا کرتا ہے اور باقی تین چوتھائی حصہ خود ہڑپ کر جاتا ہے۔ جب تک اس تین چوتھائی سرمائے کو مزدوروں میں منصفانہ طور پر تقسیم نہ کیا جائے مزدور کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکتا۔ یہ کام اس وقت ہی ہوسکتا ہے جب تک ریاست کو کنٹرول کرنے والے اداروں میں محنت کشوں کو ان کی تعداد کی مناسبت سے قانون ساز اداروں میں نمائندگی نہیں مل جاتی، اس تناظر میں لیبر کانفرنس کا یہ مطالبہ البتہ جائز ہے کہ اسمبلیوں میں مزدوروں اور ہاریوں کو ان کی تعداد کے حوالے سے نمائندگی دی جائے، لیبر کانفرنسوں میں ہاریوں کے لیے مزدور قوانین کے اطلاق کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ بادی النظر میں یہ مطالبہ بڑا منصفانہ نظر آتا ہے لیکن کانفرنس کے زعماء غالباً اس حقیقت سے واقف ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور قوانین مزدوروں کی اشک شوئی کے لیے بنائے جاتے ہیں، عملدرآمد کے لیے نہیں اور جو مزدور قوانین بنائے جاتے ہیں وہ کسی حوالے سے منصفانہ نہیں ہوتے بلکہ ان کی حیثیت حاکم و محکوم کی ہوتی ہے، ان قوانین کا ہاریوں اور کسانوں پر اطلاق محض اشک شوئی کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا، ان قوانین کے ہاریوں پر اطلاق سے وہ تضاد ختم نہیں ہوگا جو محنت اور سرمائے کے درمیان حائل ہے۔

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد تمام نوآزاد ملکوں نے ہاریوں، کسانوں اور جاگیرداروں کے درمیان صدیوں سے موجود تضاد کو ختم کرنے کے لیے زرعی اصلاحات نافذ

(بقیہ صفحہ نمبر 7 پر ملاحظہ کیجئے)

عوامی ورکرز پارٹی کے صدر کا گلف ممالک کا دورہ

عصمت شاہ جہان

تعارف:

عوامی ورکرز پارٹی کے صدر فانوس گوجرنے دوگلف ممالک (متحدہ عرب امارات اورعمان) میں پاکستانی مزدوروں کی صورتحال اور مسائل کا جائزہ لینے کے لئے جون اور جولائی کے مہینے میں تین ہفتوں کا دورہ کیا۔ پاکستانی مزور کمیونٹی نے اُنکا بھرپور استقبال کیا۔ اُنہوں نے اِن ممالک میں مختلف شہروں کے دورے کئے، وہاں مقیم پاکستانی مزدوروں کے وفود سے ملاقاتوں کیں، اور پارٹی کے تعارفی کانفرنس بھی منعقد کئے۔ اِس کے علاوہ، اِن ریاستوں میں موجود پاکستانی سفارتی عملے، مقامی سُلطانوں، کفیلوں، اورمقامی سرکاری عملے سے بھی مُلاقاتیں کیں اور مزدوروں کے مسائل اور ممکنہ حل کے بارے میں مذاکرات کئے۔ پارٹی صدر کے دورے کے مشاہدات اور سرگرمیوں پر مشتمل مختصر رپورٹ درج زیل ہیں۔

اِسوقت دنیا کے کُل تارکین وطن مزدوروں کا 10% مزدور گلف کے چھ ممالک میں ہے۔ گلف کی یہ چھ ریاستیں/ سلطنتیں بشمول بحرین، کویت، عمان، قطر، سعودی عربیہ، اور متحدہ عرب امارات' گلف کوآپریشن کونسل' (جی سی سی) کی ممبر ہیں۔ جی سی سی ایک معاشی اور سیاسی تعاون کا فورم ہے اور تارکینِ وطن مزدور اور اِنکے حقوق سے متعلقہ موضوعات کے بارے میں اہم فیصلے اِسی فورم پر کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ تمام گلف ممالک آئی ایل او کے ممبر ہیں اور انہوں نے آئی ایل او کے بیشمار کنونشنز اور پروٹوکول بھی دستخط کئے ہوئے ہیں مگر اِن ممالک کے ریاستی نظام جمہوری نہ ہونے کی وجہ سے یہاں مزدور بے انتہا استحصال، جبر اور مصائب کا شکار ہیں۔ یادرہے کہ گلف کا' کفالہ سسٹم' جس کے تحت مزدوروں کو بھرتی کیا جاتا ہے، عالمی مزدور قوانین کے عین مخالف ہے۔

اگر چہ اِن ممالک کے بادشاہوں اور اشرافیہ نے اپنے اندھیرے صحراؤں کو ایشائی مزدوروں کی محنت کے استحصال سے لش پش کاروباری وسیاحتی مراکز میں بدلا، اور برق رفتاری سے سرمایا اور پیٹرو ڈالرز بنائے جس سے دُنیا بھر میں معاشی اور سیاسی بالا دستی قائم کی، مگر اِنہی مزدوروں کا استحصال، اِنکے حقوق ، اور مزدور قوانین اِن بادشاہتوں کے ریاستی نظریات اور ڈھانچے میں موضوعاتِ ممنوعہ ہیں۔

یادرہے کہ گلف کی ان سب ریاستوں میں مطلق العنان بادشاہتیں ہیں اور یہاں کے اپنے شہریوں کو بھی بنیادی جمہوری حقوق میسر نہیں، تارکین وطن کے حقوق کا سوال تو دور کی بات، وہ بھی جنوبی ایشیاء کے پسے ہوئے غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے محنت کشوں کے استحصال کا سوال۔ کئی ریاستوں میں طبقاتی جدوجہد اور جمہوری تحریکوں کو ٹینکوں اور فوجوں کے زریعے پُرتشدد طریقوں سے کُچلا گیا۔

لیبر پاکستان کا سب سے بڑا ایکسپورٹ ہونے کے باوجود پاکستان نے بھی اپنے تارکینِ وطن مزدوروں کے حقوق کے لئے کوئی خاطر خواہ سفارتی کوششیں نہیں کیں۔ دوسرے ایشائی ممالک سے تعلق رکھنے والے مزدوروں کے اوقاتِ کار اور حالاتِ کار بھی گلف میں کچھ بہتر نہیں ہیں۔ اِسکے باوجود کہ گلف میں مزدوروں کی اکثریت جنوبی ایشاء سے ہے، مگر جنوبی ایشائی ریاستوں نے عمومی طور پر اپنے بیروزگار محنت کشوں اور محنت کاروں کو اِن ممالک کو اونے پونے بیچ دیا اور خُوب زرِمبادلہ کمایا مگر نہ ہی اِنکے حقوق مانگے، نہ ہی اِنکے حقوق کے لئے عالمی اور علاقائی طور پر کوئی خاطر خواہ سفارتی آواز اُٹھائی، اور نہ ہی اِنکے مسائل پر کوئی سفارتی اتحاد بنایا، بلکہ اُلٹا ایک دوسرے کے خلاف عالمی طور پر سفارتی دُشمنی میں مصروف رہے، اور مصائب زدہ تارکینِ وطن مزدور لُٹتے رہے۔

پاکستانی ریاست کا گلف کی ریاستوں سے تعلق ایک سامراجی گماشتہ ریاست کا ہے۔ پاکستان نے اپنے لاکھوں جوانوں کو نہ صرف مزدور بلکہ سپاہی کی شکل میں بھی گلف ممالک کو خُوب خُوب بیچا ہے، اور پاکستان کی افواج نے گلف ممالک کے لئے ٹھیکے پر دنیا کے کئی ممالک کے ساتھ سامراجی جنگیں بھی لڑی ہیں۔ اِس سامراجی اور طفیلی رشتے میں پاکستان کی ریاست کی طرف سے اپنے مزدوروں کے استحصال کا سوال اُٹھانے کی توقع رکھنا ناممکن ہے۔ البتہ عوامی ورکرز پاٹی فی الحال کچھ اصلاح پسند اقدامات کے لئے سفارتی کوششوں کے لئے جدوجہد کرسکتی ہے؛ اور ساتھ ہی ساتھ پارٹی سیاسی طور پر گلف اور سارک ممالک میں موجود ترقی پسند قوتوں کے ساتھ یکجہتی بنا کر گلف میں بائیں بازو کی مزدور تحریک اور ترقی پسند تحریک کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈال سکتی ہے۔

متحدہ عرب امارات اور عمان میں پاکستانی مزدوروں کی صورتحال:

2013 ءکے اعداد و شمار کے مطابق متحدہ عرب امارات کی کُل آبادی کا 80 فیصد تارکین وطن پر مشتمل ہے، یعنی کُل 92 لاکھ کی آبادی میں سے 73 لاکھ تارکین وطن ہیں جن میں 16 لاکھ عورتیں ہیں۔ اِن 73 لاکھ تارکینِ وطن کا 90% مزدور ہیں اور ملک میں موجود کُل مزدوروں کا 90% تارکینِ وطن مزدوروں پر مشتمل ہے اور صرف 10% اماراتی مزدور ہیں ۔ نجی شعبے میں کام کرنے والے مزوروں کا 90% بھی تارکینِ وطن ورکرز پر مشتمل ہے۔ متحدہ عرب امارات میں تقریبا 14 لاکھ پاکستانی مقیم ہیں جن میں سے کفالہ سسٹم کے تحت عارضی کانٹریکٹ پر مزدوری کرنے والے 10 لاکھ مزدور ہیں۔ یہ

مزدور کنسٹرکشن ،گھریلو خدمات ،سروسز سیکٹر،اور ٹرانسپورٹ سیکٹر میں کام کرتے ہیں۔ انٹرنیشنل ٹریڈ یونین کنفیڈریشن کیطرف سے 2015 ء میں جاری کردہ مزدوروں کے حقوق کے انڈکس متحدہ عرب امارات کو مزدوروں کے لئے بدترین ملک قرار دیتا ہے۔

عمان میں کُل تارکینِ وطن مزدوروں کا 87% مزدور انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش سے ہے، اور کُل تارکینِ وطن مزدوروں کا 82% مزدور نجی شعبے میں ہے۔ 2013ء میں عمان حکومت نے فیصلہ کیا کہ تارکینِ وطن مزدوروں کی آبادی مقامی آبادی کے 33% سے زیادہ نہیں بڑھے گی جس کے نتیجے میں 70,000 مزدوروں کو ملازمتوں سے نکال کر اپنے آبائی ممالک میں واپس بھجوایا گیا۔ عمان میں اسوقت تقریبا 235,000 رجسٹرڈ پاکستانی رہائش پذیر ہیں، جنکی اکثریت بلوچ اور پشتون مزدوروں کی ہے۔

پاکستانی مزدوروں کے نقطہ نظر سے اُنکے اہم مسائل درج ذیل ہیں:

☆ تقریبا 1200 پاکستانی مزدور متحدہ عرب امارات میں اور 600 مزدور عمان میں معمولی نوعیت کے جرائم میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں اور انکی اکثریت غربت کے باعث جرمانے ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے قید ہیں۔ کچھ پاکستانی شدید نوعیت کے جرائم میں بھی عمر قید کی سزائیں بھی کاٹ رہے ہیں۔

☆ تقریبا آٹھ سے دس مزدور ایک کمرے میں لیبر کیمپوں میں تباہ حال زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اکثر مزدورں کی تنخواہیں انتہائی کم ہیں، قرضوں کے جال میں پھنسے رہتے ہیں کہ ایمپلائرز مہینوں تک اُنکی تنخواہیں روکے رکھتے ہیں تا کہ یہ کہیں جا نہ سکیں۔ یہ مزدور اکثر اسی وجہ سے سالوں تک واپس ملک نہیں آتے کہ کہیں یہ تنخواہیں نہ کھو دیں۔ مزدوروں کے اندازے کے مطابق پاکستانی مزدوروں کی واجب الادا تنخواہیں بلین ڈالروں کی مالیت کی ہوں گی۔ تمام تارکینِ وطن مزدور کفیل / ارباب کی مرضی کے بغیر اپنی ملازمت اور شہر نہیں بدل سکتے۔ اِن کو شدید استحصال کا سامنا ہے، کم سے کم اُجرت کا تعین نہیں ہے، اور نا ہی انہیں تنظیم سازی کا قانونی حق ہے۔

☆ مزدوروں کی اکثریت کو غیر انسانی حالاتِ کار کا سامنا ہے۔ اکثر ایمپلائرز اِنکے سفری دستاویزات ضبط کر کے رکھتے ہیں اور مزدور جبری مزدوری کا شکار ہیں۔ اوقات کار اور حالاتِ کار کی نگرانی اور بہتر بنانے کا کوئی سرکاری انتظام موجود نہیں ہے۔

☆ اکثر مزدوروں کو دوسرے شہروں میں بسنے والے رشتے داروں اور دوستوں سے ملاقات کی قانونی اجازت نہیں ہے۔ رہائشی قوانین کی خلاف ورزی کی صورت میں اُنکو بھاری جُرمانے دینے پڑتے ہیں اور جیل بھی کاٹنی پڑتی ہے۔

☆ ٹرانسپورٹ سیکٹر کے مزدور بھاری جُرمانوں سے بہت تنگ ہیں، خاص طورر پر دُبئی میں ٹیکسی چلانے والوں کو قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں 10,000 سے 50,000 درہم تک کے جرمانے دینے پڑتے ہیں، جنکو بھرنا اُنکی مالی استطاعت سے بالکل باہر ہے اور یہ جُرمانے بھرتے بھرتے وہ قرضوں میں ڈوب چکے ہیں۔

☆ شہریت کے قوانین سخت ہونے کی وجہ سے اکثر مزدور دہائیوں تک ورک پرمٹ (اقامہ) پر رہتے ہیں اور ویزہ یا اقامہ ختم ہونے کی صورت میں غیر قانونی طور پر انتہائی کم اُجرت پر کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

☆ ابوظہبی میں پاکستانی سفارت خانے کے کمیونٹی سنٹر میں ثقافتی سرگرمیوں کی قانونی اجازت نہیں ہے جسکی وجہ سے مزدور کی زندگی بالکل بیگار کیمپ کی طرح صرف کام تک محدود ہے اور مزدوری دینے والی مشین بن چکی ہے۔

☆ دبئی میں پاکستان کے قونصل خانے نے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کے تجدید کے لئے جولائی میں اُن لائن سروس تو کھول دی ہے مگر ناخواندگی اور پسماندگی کی وجہ سے اکثر مزدور اس سروس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے اور اُنہیں سفارتی عملے کو تحائف دے کر اپنے کاغذات بنوانے پڑتے ہیں۔

صدر فانوس گوجر نے پاکستان کے سفیروں، قونصل جنرل، کئی مقامی سلطانوں اور کفیلوں کے ساتھ ملاقاتیں کیں، اور ان مسائل کو اُٹھایا۔ اُنہوں نے اپنے دورے کے دوران پاکستانی سفارتی عملے کی مدد سے 84 پاکستانی قیدیوں کو عمان کی جیلوں سے رہا کرایا۔ اُنکی پاکستان واپسی کے بعد پاکستانی سفارتکاروں نے مزید 300 قیدیوں کو بھی رہا کرایا۔

پارٹی صدر نے متحدہ عرب امارات اور عمان میں پاکستان کے سفیروں اور دوسرے سفارتی عملے سے ملاقاتوں کے دوران اُنہیں پاکستانی مزدوروں کے درج بالا مسائل اور ممکنہ حل کے بارے میں باقاعدہ میمورنڈم پیش کئے۔ جسمیں کئی قابلِ عمل شفارشات درج تھیں اور اُن سے مطالبہ کیا کہ حکومتِ پاکستان مزدوروں کے مسائل اور قیدیوں کی عام معافی کے لئے اِن مما لک سے باقاعدہ سفارتی میورنڈم کے تحت مندرجہ ذیل اقدامات کا مطالبہ کرے:

☆ وہ تمام قیدی جو جرمانے ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے جیلوں میں سزائیں کاٹ رہے ہیں، حکومتِ پاکستان اُن کے جُرمانے ادا کرے اور اگر وہ وطن واپس آنا چاہیں تو اُنکی واپسی کا انتظام کرے۔ لمبی سزائیں کاٹنے والے قیدیوں کو پاکستانی جیلوں میں منتقلی کا سفارتی زریعہ ڈھونڈا جائے تاکہ قیدی اپنی سزا پاکستان کے اندر پوری کریں اور کم از کم اپنے پیاروں سے ملاقات تو کر سکیں۔

☆ تارکینِ وطن مزدوروں کو دوسرے شہروں میں بسنے والے اپنے عزیزوں اور دوستوں سے مُلاقات کا قانونی حق دلایا جائے۔

☆ کم سے کم اُجرت اور لیبر سٹینڈرڈز کی نگرانی کے نظام کا مطالبہ کیا جائے۔ ایمپلائرز کی طرف سے اُجرت روکنے کے خلاف رپوٹنگ کے نظام کا بھی مطالبہ کیا جائے، تا کہ مزدوروں کو اپنی تمام اُجرت بروقت ادا ہو۔

☆ ابوظہبی میں پاکستانی سفارت خانے کے کمیونٹی سنٹر کے لئے وزارتِ ثقافت سے

ثقافتی سرگرمیوں کے لئے اجازت لی جائے۔

پاکستانی سفارتخانے اور قونصل خانے اپنے تمام پکستان کمیونٹی سنٹرز میں لیبر ڈسک (Labour Desk) کا قیام کرے، جو کہ مزدوروں کے تمام مسائل حل کرنے میں مددگار کے طور پر کام کرے؛ اور مزدوروں کے لئے مزدور قوانین، اور دوسرے ملکی قوانین پر تعلیمی پروگراموں کا اجراء کرے۔

پارٹی صدر نے کئی شہروں میں مزدوروں کے وفود سے ملاقاتیں کیں، پارٹی کے تعارفی کانفرنس اور اجلاس منعقد کئے ۔ اِن کانفرنسوں اور اجلاسوں نے پارٹی کی تنظیم سازی کے لئے درج ذیل اُرگنائزنگ کمیٹیوں کا انتخاب کیا:

ابوظہبی آرگنائزنگ کمیٹی :

فاروق محمد، صدر؛ زبیرخان، جنرل سیکرٹری؛ اور فرمان، سیکریٹری فنانس۔

شارجہ آرگنائزنگ کمیٹی :

جہانزیب خان، صدر؛ بخت علی، سینئر نائب صدر؛ ظاہر شاہ، نائب صدر؛ ساجد بونیری، جنرل سیکرٹری؛ نور محمد، ڈپٹی جنرل سیکریٹری؛ ولی خان، سیکریٹری انفارمیشن؛ موسیٰ خان، سیکریٹری لیبر؛ محمد اقبال، سیکریٹری کلچر؛ اور سلیم شاہ، سکریٹری فنانس۔

متحدہ عرب امارات آرگنائزنگ کمیٹی:

ریاض خان، صدر؛ شیر زمین، سینئر نائب صدر؛ اختر وزیر، نائب صدر؛ انجینئر شاہ زادہ، جنرل سیکریٹری؛ جنید گوجر، ڈپٹی جنرل سیکریٹری؛ اور حیدر خان، سیکریٹری انفارمیشن۔

دبئی آرگنائزنگ کمیٹی:

خیال محمد، صدر؛ اور گل صدبر، جنرل سیکریٹری۔

پارٹی تارکین وطن مزدوروں کے مسائل اور تحریک کی تعمیر پر اِس سال کے اُخر میں 'اورسیز لیبر کانفرنس' کرے گی، جس کے موضوعات، جگہ اور وقت کا تعین اُنے والی فیڈرل ایگزیکٹیو کمیٹی کے اجلاس میں کیا جائے گا۔

☆☆☆

انجمن ترقی پسند مصنفین کراچی کی خصوصی ادبی نشست

گزشتہ ہفتے انجمن ترقی پسند مصنفین کراچی کی خصوصی ادبی نشست ڈیفنس سوسائٹی میں پروفیسر انیس زیدی کی قیام گاہ پر منعقد ہوئی تاکہ ڈیفنس اور کلفٹن میں رہنے والے بھی آسانی سے اس ادبی محفل میں شرکت کرسکیں، اس نشست کی صدارت انجمن کے مرکزی جنرل سیکریٹری جنرل ڈاکٹر سید جعفر احمد نے کی جبکہ نظامت کے فرائض جناب حامد علی سید نے انجام دیئے، سب سے پہلے کراچی انجمن کے جنرل سیکریٹری سید علی اوسط جعفری نے انجمن کی کارکردگی پر روشنی ڈالی اور انجمن کی مختصر تاریخ وہاں کے لوگوں کو بتائی اور انجمن کی ادبی نشستوں کے انعقاد سے آگاہ کیا اور یہاں کے لوگوں کو ان میں شرکت کی دعوت بھی دی، نیز پروگرام کے مطابق اس نشست کے لیے ڈاکٹر جمال نقوی نے ایک مضمون پیش کیا جس کا عنوان ''مزاحمتی ادب'' تھا۔

اس مضمون میں کہا گیا کہ ادب اور زندگی کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے مگر ایک وقت ایسا بھی تھا جب ابتدا میں مذہب اخلاقیات اور تہذیب کے نام پر صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن جیسے جیسے انسانی شعور میں اضافہ ہوتا رہا احتجاجی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں اور سماج کے باشعور افراد اپنی تحریروں میں شاعر و افسانہ نگاری کے ذریعہ اپنی بات کہتے رہے ہیں ان میں میر غالب، حسرت جیسے شعرا بھی شامل ہیں اور پریم چند، قراۃ العین حیدر جیسے کہانی کار بھی، غالب نے کتنی خوبی سے حقائق بیان کردیئے۔

بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

جب ترقی پسند تحریک نے مقصدی افادی اور ترقی پسند ادب کی بات کی تو احتجاجی اور مزاحمتی ادب کا فروغ ہوا اور احتجاجی ادب کے ذریعہ استحصال، ظلم وزیادتی اور سماجی ناہمواریوں کا ذکر عام ہونے لگا، ہمارے ہاں دورِ آمریت میں لکھے جانے والے ادب کو خصوصی طور پر ترقی پسند اور مزاحمتی ادب گردانا جاتا ہے کیونکہ اس دور میں ترقی پسند شاعر ادیبوں اور ادبی تنظیموں پر پابندی لگادی گئی تھی اور تخلیق کاروں کو قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں، اس کے باوجود ادب تخلیق کیا جاتا رہا، اس موقع پر فیض احمد نے کہا:

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

ڈاکٹر جمال نقوی کے مضمون کے بعد جن حضرات نے اس مضمون پر اظہار خیال کیا وہ یہ ہیں پروفیسر انیس زیدی، جناب حبیب حیات محترمہ زیب النساء زیبی، جناب سلیم الدین شیخ، جناب سلطان نقوی، محترمہ یاسمین نگار، ڈاکٹر فہیم شناس اور محترمہ سلطان ثروت شامل ہیں، محفل کے صاحب صدر ڈاکٹر سید جعفر احمد نے صدارتی خطبہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ادب کا آغاز وہاں سے ہوا جہاں سے انسانی سماج کا آغاز ہوتا ہے، آپ نے کہا کہ تضادات اور تصادم میں ترقی پسند اپنا راستہ خود نکالتے رہے ہیں کیونکہ ترقی پسندی بہت پہلے سے موجود تھی، الطاف حسین حالی، اقبال، جوش اور دیگر اساتذہ نے یہ عمل جاری و ساری رکھا اور پچھلے زمانوں میں بھی ترقی پسند شاعری کے اشارے ملتے ہیں، آپ نے کہا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین صرف مصنفین کی ہی انجمن نہیں ہے یہ ایک بہت بڑا پلیٹ فارم تھا جو آرٹسٹ، مصور، کہانی کار اور شاعروں کا ایک وسیع وعریض میدان رہا ہے اور ہے جناب صدر نے مزید کہا کہ ترقی پسند تحریک نے احتجاج اور مزاحمت پر مذہب، اخلاقیات اور تہذیب کے تعمیر کردہ بندوں کو توڑ کر شاعروں، ادیبوں اور قلم کاروں اور دانشوروں کو اظہار کی آزادی سے ہمکنار کیا، اس طرح ہمارے ادب میں ترقی پسند تحریک کا بڑا اہم کردار ادا ہے اور مزاحمتی ادب نے سماج میں ایک فکری سماجی اور سیاسی بیداری پیدا کی ہے، بعدازاں موجود شعرائے کرام نے سامعین کو اپنے کلام سے محفوظ فرمایا۔

جن شعرا نے کلام پڑھا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں حامد علی سید، سید علی اوسط جعفری، محترمہ زیب النساء زیبی، محترمہ فرزانہ انجم، سعد الدین سعد، ڈاکٹر فہیم شناس کاظمی، پروفیسر انیس زیدی، ڈاکٹر جمال نقوی اور محترمہ ثروت سلطان ثروت۔

''پاکستان میں سیکولرازم کا سوال''

رپورٹ: عابد شکیل فاروقی

عوامی ورکرز پارٹی کراچی نے موجودہ سیاسی صورتحال کے تناظر میں ''پاکستان میں سیکولرازم کا سوال'' کے عنوان سے، مورخہ 13 اگست بروز اتوار، کراچی پارٹی کے مرکزی دفتر میں پارٹی اور دیگر سیاسی اراکین کی سیاسی اور نظریاتی تربیت کے لئے دو مختلف موضوعات پر لیکچر کا اہتمام کیا، جسمیں پارٹی رہنماؤں اور کارکنان نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ لیکچر کے لئے موضوعات تھے:

مذہبی انتہاپسندی اور حکمراں طبقے کا کردار۔

سیکولر ریاست کیوں ضروری ہے۔

پروگرام کے میزبان، AWP کراچی کے سیکریٹری جناب شفیع شیخ نے، حاضرین کو پروگرام کی غرض وغائت اور دیگر تفصیلات کے بارے میں بتایا ان کے بیان کے مطابق، دیئے گئے موضوعات پر بولنے کے لئے مشہور و معروف دانشور اور
جامعہ کراچی سے منسلک ڈاکٹر جعفر احمد اور معروف سیاسی وسماجی تجزیہ نگار جناب وسعت اللہ خان کو دعوت خطاب دی گئی تھی، لیکن عین وقت پر جناب وسعت اللہ خان تشریف نہ لا سکے، جس کے باعث ڈاکٹر جعفر احمد کو دونوں موضوعات کو اپنی گفتگو میں سمیٹنا پڑیگا۔

اپنے لیکچر میں ڈاکٹر صاحب نے، موضوع کی مناسبت سے سیکولر کا مفہوم، ایک سیکولر سٹیٹ میں ریاست کا کردار اور قیام پاکستان سے قبل متحدہ ہندوستان کی تاریخ و معاشرتی ساخت پر نہائیت تفصیل سے روشنی ڈالی اور تقسیم ہند سے قبل کے سیاسی تناظر میں مسلم لیگ کے سیاسی نعرے ''دو قومی نظریئے'' کی اصل حقیقت سے حاضرین کو آگاہ کیا۔

انہوں نے بتایا کہ مذہب ایک شہری کا ہوتا ہے ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، ایک سیکولر سٹیٹ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ایک سیکولر ریاست میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے اختلافات ریاست پر اثرانداز نہیں ہوتے، جبکہ ایک غیر سیکولر ریاست کے اندر سماجی تنوع ریاست کے سیاسی ڈھانچے پر اثرانداز ہوسکتا ہے جسکی مزید تشریح کرتے ہوئے انہوں کہا کہ تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کے اندر جو ثقافتی تنوع (Cultural Diversity) تھا اس کے تناظر میں مسلم لیگ کو اس خدشے کا احتمال تھا کہ وہاں اس وقت جو Cultural Majority تھی وہ مستقل Political Majority بن جائیگی اور جو Cultural minority تھی وہ مستقل Political Minority میں بدل جائیگی۔

اپنے لیکچر میں ڈاکٹر صاحب نے بیان فرمایا کہ 1940ء کی قرارداد میں ہندوستان کو توڑنے کی بات نہیں تھی بلکہ اس میں ایک طرح کی کنفیڈریشن کی تشکیل کی بات کی گئی تھی۔ اپنے لیکچر کے دوران انہوں حاضرین کو آگاہ کیا کہ 1927ء میں مسلم لیگ نے مطالبہ کیا کہ اگر مسلم اکثریتی صوبے سندھ، پنجاب، شمال مغربی صوبہ سرحد، اور بلوچستان کو صوبے بنا دیا جائے اور مرکز میں مسلمانوں کی نمائندگی بڑھا کر 33% کردی جائے تو وہ جداگانہ طریقہ انتخاب سے دستبردار ہونے کو تیار ہیں، یہ وہ حق تھا جس کی بنیاد پر 1906ء میں مسلم لیگ کی تشکیل ہوئی تھی اور جو 1909ء میں تسلیم کیا گیا تھا۔

سیکولرازم پاکستان کی ضرورت کے موضوع کی مناسبت سے ڈاکٹر صاحب نے جناح صاحب کی 11 اگست والی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انکی دو قومی نظریئے کی بات ایک پولیٹیکل بیان تھا، جسکا مطلب تھا کہ مسلمان ایک سیاسی وحدت ہیں اور ہندو ایک سیاسی وحدت ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو قیام پاکستان کے بعد جب مشرقی بنگال پاکستان کا حصہ تھا تو اس میں غیر مسلم آبادی، کل آبادی کا سولہ سے سترہ فیصد بنتی تھی اور اگر اس وقت کھلنا یا راج شاہی کوئی ہندو اٹھ کر قائداعظم سے دوقومی نظریئے کی بنیاد پر یہی مطالبہ کرتا کہ جناح صاحب دوقومی نظریہ اگر 14 اگست سے قبل Relevant تھا تو آج بھی Relevant ہے تو ہم بھی اسی بنیاد پر مشرقی بنگال میں ہندو اکثریتی اضلاع کے لئے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کرتے ہیں، تو اس کو روکنے کے لئے قائداعظم نے کہا کہ چونکہ اب بن چکا ہے اس لئے اب ہم وہ غلطی نہیں دہرانا چاہتے جو ہمارے مخالفین کی طرف سے ہوئی، ہمیں چاہئیے کہ ہم پاکستان میں ایک ریاست بنائیں جہاں مستقل اکثریت اور مستقل اقلیت کا مسئلہ نہ ہو، پھر انہوں نے کہا کہ اس سے سبق سیکھ کر ہم ایک ایسی ریاست تشکیل دیں جو غیر جانبدار ریاست ہو اور شہریوں کے مذہبی اعتقادات سے اس ریاست کا کوئی لینا دینا نہ ہو، اگر ایسا نہ ہوسکا تو ہم کامیاب نہیں ہوسکتے، اور پھر انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس کو بنیاد بنالیں تو آپ دیکھیں گے کہ وقت کے ساتھ ساتھ مسلمان مسلمان نہیں رہے گا اور ہندو ہندو نہیں رہے گا، مذہبی مفہوم میں نہیں، کیونکہ یہ تو فرد کا ذاتی معاملہ ہے، بلکہ ریاست کے شہری ہونے کی حیثیت سے یہ بالکل ایک سیکولر ریاست کا تصور ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے لیکچر کے بعد کارکنان نے ان سے سوالات کئے جنکے انہوں تسلی بخش اور تفصیلی جوابات دیئے۔

ڈاکٹر صاحب کے لیکچر اور سوال وجواب کے بعد میزبان نے آج کی تقریب کے صدر، AWP کے مرکزی سینئر نائب صدر جناب یوسف مستی خان کو دعوت خطاب دی، جنہوں نے اپنی تقریر میں موضوع کی مناسبت سے آج کے لیکچر کی اہمیت پر زور دیا اور پروگرام کو انتہائی کامیاب قرار دیا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، تمام حاضرین کا بھی شکریہ ادا کیا، بعد ازاں حاضرین کی چائے پانی سے تواضع کی گئی۔

عوامی ورکرز پارٹی کراچی، ورکرز ہال میں سیکولرازم پر اسٹڈی سرکل سے ڈاکٹر جعفر احمد خطاب کر رہے ہیں

عوامی ورکرز پارٹی جموں کشمیر کا تنظیمی اجلاس

جبری گمشدہ افراد کی بازیابی کے لئے کراچی پریس کلب پر مظاہرہ

عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی صدر جناب فانوس گوجر متحدہ عرب امارات اور عمان میں پارٹی کارکنوں

اور پاکستان سفارت خانے کے حکام سے ملاقات کر رہے ہیں

کون آزاد ہوا

علی سردار جعفری

کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا

خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لئے
موت آزاد ہے لاشوں پہ گذرنے کے لئے

چور بازاروں میں بدشکل چڑیلوں کی طرح
قیمتیں کالی دکانوں پہ کھڑی رہتی ہیں
ہر خریدار کی جیبوں کو کترنے کے لئے

کارخانوں پہ لگا رہتا ہے
سانس لیتی ہوئی لاشوں کا ہجوم
بیچ میں ان کے پھرا کرتی ہے بیکاری بھی
اپنا خونخوار دہن کھولے ہوئے
اور سونے کے چمکتے سکے

ڈنک اٹھائے ہوئے پھن پھیلائے
روح اور دل پر چلا کرتے ہیں
ملک اور قوم کو دن رات ڈسا کرتے ہیں

روٹیا چکلوں کی قحبائیں ہیں
جن کو سرمائے کے دلالوں نے
نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے

بالیاں دھان کی، گیہوں کے سنہرے خوشے
مصر و یونان کے مجبور غلاموں کی طرح
اجنبی دیس کے بازاروں میں بک جاتے ہیں
اور بدبخت کسانوں کی بلکتی ہوئی روح
اپنے افلاس میں منہ ڈھانپ کے سو جاتی ہے

ہم کہاں جائیں، کہیں کس سے کہ نادار ہیں ہم
کس کو سمجھائیں غلامی کے گنہگار ہیں ہم
طوق خود ہم نے پنھا رکھا ہے ارمانوں کو

اپنے سینے میں جکڑ رکھا ہے طوفانوں کو
اب بھی زندان غلامی سے نکل سکتے ہیں
اپنی تقدیر کو ہم آپ بدل سکتے ہیں